محیؒ الدینؒ

اورنگ زیب عالمگیرؒ

اورنگ زیب عالمگیرؒ

(اضافہ شُدہ ایڈیشن)

سعدی سنگروری

اُس مسلمان درویش بادشاہ کی سرگزشت، زندگی بھر جس کے ایک ہاتھ میں تلوار اور دُوسرے میں قرآن رہا۔

وحید بُک سنٹر
کمرہ نمبر S/4 ۔ دُوسری منزل، سٹار سائنس مارکیٹ
تکیہ اِملی والا ○ آبکاری روڈ ○ لاہور

اِنتساب

ہمدردِ ملک وملّت مُحترم حکیم محمد سعید صاحب چیئرمین
ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان
بانی مدینۃ الحکمت، مؤسس شامِ ہمدرد
کے نام
جو احیائے علم وحکمتِ اسلامی کے لیے گرانقدر خدمات
انجام دے رہے ہیں۔

سعدی سنگروری
۲۵ر مئی ۱۹۹۱ء

ناشر : محمد رفیق چودھری

مطبع : ناصر اینڈ برادرز پرنٹرز، لاہور

اشاعت : 1998ء

قیمت : 100/= روپے

فہرس

اظہارِ خیال

از - جسٹس قدیر الدین احمد سابق چیف جسٹس مغربی پاکستان) گورنر سندھ

"کتاب مختصر ہے اس لئے میں نے اس کو (ایک ہی نشست میں) پڑھ لیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اورنگزیب کے عہد (حکومت) کے متعلق کتاب لکھنے کی ضرورت ہے۔ اس شہنشاہ کی ذاتی زندگی سے زیادہ اس کے عہد کے حالات اس طرح واضح کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ روح انسانیت اور خدا ترسی جو اس کے عہد کا شیوہ تھا نکھر کر سامنے آجائے۔

سعدی سنگروری صاحب نے چند اوراق میں بہت کچھ کہہ دیا ہے تاہم (ابھی) یہ بہت کم ہے اور کتاب کی تاریخی بلندی بغیر حوالہ جات کے کھلتی نہیں۔ یہ کام کرنے کا ہے۔ اور اعلےٰ معیار پر کرنے کا ہے۔

اورنگزیب کا عہد قدیم اور جدید زمانوں کے درمیان کا عہد ہے۔ یہ پہلو ظاہر اس وجہ سے نہیں ہوتا کہ جدید زمانہ آنے سے پہلے جو خانہ جنگی اور بربادی ہوئی وہ نگاہوں کو ایک عہد سے دوسرے عہد تک جانے سے روک لیتی ہے۔ اس زمانے کا اصلی تحفہ شاہ ولی اللہ ہیں۔ اور عام مسلمانوں کا یہ احساس ہے کہ بادشاہوں اور سرداروں کا زمانہ ختم ہوا۔ اس لئے خود عام مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ اپنی عزت اور اپنے وقار کو قائم کریں چنانچہ اس وقت سے لے کر پاکستان بننے تک چار پانچ تحریکیں ظہور پذیر ہوئیں۔

کتاب کے مصنف اورنگ زیب کی تلوار کا ذکر اس طرح کرتے ہیں۔

سے جیسے قرآن پاک کا کتاب کا ٹائٹل پیج اس کا شاہد ہے' وہ تلوار نری طاقت کی علامت تھی یا وہ صداقت کی حمایت کی چمک دمک تھی پہلا خیال طرزِ قدیم ہے دوسرا جدید ہے۔"

(نوٹ) اورنگزیب کے پہلے ایڈیشن پر یہ خط محترم جسٹس قدیرالدین احمد نے محترم حکیم محمّد سعید چیئرمین ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان کے نام لکھا تھا ہم اس خط کو حکیم صاحب قبلہ کے شکریے کے ساتھ شائع کر رہے ہیں. سرورق پر تلوار کی علامت مُصنّف کی طرف سے نہیں ناشر کی جانب سے دی گئی تھی۔ جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر نے اپنی زندگی کا بیشتر حصّہ جہاد کرتے بسر کیا بہرکیف ہم اس سلسلے میں محترم جسٹس قدیرالدین احمد کے شکرگزار ہیں کہ انہوں نے ہماری رہنمائی فرمائی۔

چودھری محمّد رفیق
ناشر: وحید بک سنٹر، لاہور

تمہید

مغلوں کا عہد حکومت اسلامی ہندوستان کی تاریخ کا آخری دور اور تاریخ ہند کا نہایت اہم حصہ ہے۔ یہ عجب اتفاق ہے کہ مغلیہ حکومت کے بانی ظہیر الدین بابر سے اورنگ زیب عالمگیر تک نسل در نسل چھ پشتیں مغلیہ خاندان کی گل سرسبد شمار ہوتی ہیں۔

اورنگ زیب عالمگیر مغلیہ سلسلے کا ایک ایسا آخری باجبروت حکمران ثابت ہوا جس کی آنکھ بند ہوتے ہی اسلامی ہندوستان کا چراغ گل ہو گیا۔ اورنگ زیب عالمگیر نے ۱۷۰۷ء میں وفات پائی۔ بقول صاحبزادہ محمد عمر مرحوم کے سچ تو یہ ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر کے دم واپسیں کے ساتھ ہی اسلامی ہندوستان کا زوال شروع ہو گیا۔

اسلامی ہندوستان کیوں زوال پذیر ہوا۔ اس کے اسباب و محرکات کیا تھے۔ مؤرخوں نے اس باب میں بڑی موشگافیاں کی ہیں۔ مگر اس کا سب سے بڑا سبب یہی تھا کہ تخت و تاج کے وارثوں کے درمیان کوئی ایسا قانون موجود

نہیں تھا جس سے بغیر آپس میں لڑنے بھڑنے کے ایک کے بعد کوئی دوسرا تاجدار تخت نشین ہو سکتا۔ چنانچہ ہندوستان کے تخت و تاج کے لیئے باہمی خانہ جنگی نے ہندوستان کے غیر مسلموں بالخصوص اُن لوگوں کو طبع آزمائی کے مواقع فراہم کیئے جو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سخت بغض و عداوت رکھتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اورنگ زیب کی وفات کے ساتھ ہی اس کے جانشینوں کی حکومت برائے نام رہ گئی۔ لہٰذا یہ کہنا کہ اورنگ زیب کے جانشین نا اہل تھے اور یہ کہ اورنگ زیب تنگی مزاج واقع ہوا تھا حقیقت کے بالکل خلاف ہے۔

آپس کے جنگ و جدل نے کسی کو اپنی خداداد صلاحیتوں کے بروئے کار لانے کا موقع ہی کہاں دیا تھا جس سے کسی کی قابلیت اور صلاحیت کے باب میں کوئی حکم لگایا جا سکے۔ اور وہ شخص جو پچاس برس تک تن تنہا پورے ہندوستان پر نہایت کامیابی سے حکومت کرے حالانکہ وہ اس مدت میں اپنی عمر کا بیشتر حصہ ملک کے غداروں اور باغیوں کی سرکوبی کے لئے میدانِ جنگ میں گزارے، کبھی وہمی اور تنگی مزاج کا آدمی نہیں ہو سکتا۔

مسلسل کامیاب نبرد آزمائی کے لئے طبیعت میں جوہر استقلال اور یقین و اعتماد کی دولت کا ہونا شرطِ اوّلیں ہے اور اس شرط کو اورنگ زیب عالمگیر نے بحسن و خوبی پورا کیا ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ پروفیسر جے۔ اے سیلے کے قول کے مطابق سیاسیات اور تاریخ ایک ہی مطالعے کے دو پہلو ہیں۔ اکثر انگریزوں نے جتنی بھی اسلامی ہندوستان کی تاریخیں لکھی ہیں ان میں انھوں نے اپنے وطن کی سیاسی اغراض کو ہمیشہ اپنی نگاہوں کے سامنے رکھا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ

اسلامی ہندوستان کی تاریخ کا مواد انہیں میر جعفر ایسے ملت فروش لوگوں کے ذریعے سے ملا ہے۔ اس لئے ایک اورنگ زیب کیا اسلامی ہندوستان کی تاریخ کا ایک بھی فرد اس حالت میں نہیں ملتا جس کی شخصیت کو غلط سلط بیانات سے مجروح کر کے دم نہ لیا ہو۔ اسے حکومت کے لئے نااہل اور بدوضع ثابت نہ کیا ہو۔

زیر نظر کتاب اسی غلط تاثر کو مٹانے کے سلسلے کی ایک سعی ہے، جسے اسلام اور مسلمانوں کے دشمنوں نے حقیقت کی نقاب کشائی کا فریب دے کر پیدا کیا ہے۔ ہم اپنی اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوئے، اس کا فیصلہ وہ حضرات خود کریں گے جو غالب علیہ الرحمہ کی زبان میں اس طرح سے کہتے ہیں کہ

؎ ہم سخن فہم ہیں غالبؔ کے طرفدار نہیں ہیں

سعدی سنگروری

۱۰ مئی ۸۳ء

۹۔ دھنی رام روڈ انار کلی۔ لاہور

نام و نسب

محی الدین اورنگ زیب عالمگیر ابن شہاب الدین محمد شاہجہاں صاحبقران ثانی ابن نورالدین محمد جہانگیر ابن جلال الدین محمد اکبر ابن نصیر الدین محمد ہمایوں ابن ظہیر الدین محمد بابر ابن عمر شیخ مرزا ابن سلطان ابوسعید مرزا ابن سلطان محمد مرزا ابن جلال الدین میران شاہ مرزا ابن امیر تیمور گورگان صاحب قرانِ اوّل۔

گورگان کے معنی ترکی زبان میں داماد کے ہیں۔ چونکہ امیر تیمور نے ترکوں کے اکثر خاندانوں میں شادیاں کر لی تھیں اس لئے اس مناسبت سے اس کی وجہ تسمیہ گورگان مشہور ہوگئی۔ برنیئر نے لکھا ہے کہ امیر تیمور خاں نے سلطان ابوسعید بہادر خاں کی بیٹی سے شادی کر لی تھی جو اس وقت تاتاریوں کے اس قبیلے کا بہت بڑا سردار اور ایران کا ایک زبردست بادشاہ تھا۔ جسے مغل کہتے ہیں۔ اس لئے وہ اس رشتے کی مناسبت سے مغلوں میں داخل ہو گیا۔ درحقیقت

برنیئر کا یہ بیان تاریخ سے قطعی ناواقفیت کی دلیل اور غلط محض ہے، اصل میں امیر تیمور کا تعلق الوس چغتائی کی برلاس شاخ سے تھا۔ جو چنگیز خاں ہی کی اولاد ہے۔

ترکی مؤرخوں کا بیان ہے کہ قدیم زمانے میں النجہ خاں ایک بادشاہ کے یہاں دو جڑواں بیٹے پیدا ہوئے۔ ایک کا نام مغول رکھا گیا دوسرے کا نام تاتار۔ بعد میں ان کی نسل انہی کے نام پر مغل اور تاتار کہلائی۔ یہ دونوں قبیلے ایک مدت تک تو شیر و شکر رہے۔ لیکن جب ایل خان مغلوں کا سردار بنا اور مونج خاں تاتاریوں کا تو ان میں جنگ ہوگئی۔ تاتاری غالب آئے اور مغل مغلوب ہوگئے۔ پھر کچھ زمانے کے بعد مغلوں نے متحد ہو کر تاتاریوں کی شان و شوکت کا خاتمہ کر دیا۔ اور اس وقت سے تمام ترکی قبیلوں کے خود سردار بن گئے۔ حتیٰ کہ یسوکی بہادر خاں تک پھر انہی میں سے سلسلہ بسلسلہ سردار ہوتے رہے۔

۵۴۹ھ میں یسوکی بہادر خان کے یہاں ایک بیٹا پیدا ہوا۔ جس کا نام تموچن رکھا گیا۔ اگرچہ اس کے باپ یسوکی خان نے بہت سی فتوحات حاصل کیں اور تمام قبیلوں کو منظم بھی کیا۔ تاہم قبیلوں کی تعداد چالیس ہزار خیموں سے زیادہ نہ تھی۔ ۱۱۷۵ء میں جب اس نے انتقال کیا تموچن کی عمر اس وقت صرف تیرہ سال کی تھی۔ مغل سرداروں نے اسے کمسن اور کمزور پا کر اپنی علیحدہ علیحدہ خود مختار حکومتیں قائم کر لیں۔ تموچن ایک طویل مدت تک ان

سے لڑتا رہا، آخر کار بیس برس یا تیس سال کی مسلسل لڑائیوں کے بعد وہ انہیں اپنا مطیع بنانے میں کامیاب ہوگیا۔ اب اس کے بعد وہ تموچن کی بجائے چنگیز خاں کے لقب سے مشہور ہوا۔

لین پول لکھتا ہے کہ مغلوں کی تاریخ اصل میں چنگیز خان سے شروع ہوتی ہے جو بڑی غیر معمولی طاقت کا انسان تھا۔ رہا لفظ مغل تو یہ چوتھی صدی ہجری کی ایجاد ہے۔ یعنی جب مغل شاخ کے خوانین ساری قوم فراز کے سردار پائے تو لفظ "مغل" بھی تمام قوم کے لئے استعمال ہونے لگا۔ یعنی کل، جز کے نام سے پکارا جانے لگا۔

چنگیز کے معنی طاقتور بادشاہ کے ہیں۔ جس زمانے میں وہ تمام ترکی قبیلوں کا سردار تسلیم کیا گیا اور چنگیز خاں کے لقب سے ملقّب ہوا اس کی عمر چوالیس ۴۴ برس کی تھی۔

چنگیز خاں بلاشبہ ایشیا کا سکندر اعظم تھا۔ اس نے بیس برس کی مدت میں اتنی بڑی سلطنت حاصل کرلی کہ اس سے پہلے کسی اور بادشاہ کو نصیب نہیں ہوئی۔

ابھی فتوحات کا سلسلہ جاری تھا کہ ۶۲۴ھ بمطابق ۱۲۲۷ء یعنی خلیفہ بغداد ناصرالدین اللہ عباسی کے انتقال کے دو سال بعد چنگیز خاں فوت ہوگیا۔ مرنے سے پہلے اس نے مغل سرداروں کی روایات کے مطابق تمام مفتوحہ ممالک اپنے چاروں بیٹوں

میں حسب ذیل ترتیب سے تقسیم کر دیئے۔

بڑے بیٹے جوجی خاں کو دشت قبچاق ، داغستان ۔ خوارزم

بلغار روس اور اس سے ملحقہ علاقے بحر غربی کے ساحل تک ۔

دوسرے بیٹے چغتائی خاں کو ایغور ۔ ماورالنہر مشرقی ترکستان

تیسرے بیٹے تولی خاں کو خراسان ۔ دیار بکر مغربی علاقہ وغیرہ

چوتھا بیٹا اوکدائی خاں جو سب سے چھوٹا تھا اسے بلاد داصل ،

خطا چین ، معمورہ مشرقی تک کا علاقہ دے دیا ۔ اور اسکے بعد قاآن اعظم

یعنی قبیلے کا سردار مقرر کرنے کی وصیت کی اور حکم دیا کہ دوسرے بھائی اس

کے مددگار معین اور تابع رہیں گے ۔ اور کوئی فرد اس کے حکم کے خلاف

نہ چلنے پائے ۔

چنگیز خاں کی اولاد میں تولی خاں کا بیٹا ہلاکو خاں تھا ۔ جس نے

بغداد کے آخری عباسی خلیفہ مستعصم باللہ کو بڑی بے رحمی سے قتل

کیا ۔ چغتائی خاں کی اولاد سے امیر تیمور تھا جو سلطنت مغلیہ ہند

کے بانی ظہیر الدین بابر کا مورث اعلیٰ تھا ۔

امیر تیمور ۷۳۶ھ مطابق ۱۳۳۵ء میں پیدا ہوا ۔ جوان ہوا تو اپنی

خداداد لیاقت اور صلاحیت کی بدولت کش کا حاکم بن گیا ۔ کچھ عرصے

تک ایک چغتائی حاکم کا وزیر بھی رہا ۔ ۷۷۱ھ مطابق ۱۳۶۹ء کے

لگ بھگ میور غتمش کو جس کا امیر تیمور وزیر تھا اپنی لیاقت سے

تمام اختیارات سے محروم کر کے خود فرمانروا بن گیا

۷۸۲ھ بمطابق ۱۳۸۰ء میں امیر تیمور نے ایران پر حملہ کیا اور صرف سات برس کی قلیل مدت میں خراسان، جرجان، مازندران، سیستان، افغانستان۔ فارس۔ آذربائیجان اور کردستان وغیرہ ممالک فتح کر لیے
۷۹۵ھ بمطابق ۱۳۹۳ء میں تیمور نے آل جلائر سے بغداد چھین لیا اور الجزیرہ پر قابض ہوگیا۔ ۸۰۰ھ میں اس نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ اور ۸۰۱ھ میں دہلی اور کشمیر کو فتح کیا۔ ۸۰۴ھ بمطابق ۱۴۰۱ء میں وہ فاتحانہ شان کے ساتھ اناطولیہ میں داخل ہوا۔ وسیواس اور ملاطیہ کو فتح کرنے کے بعد ترکان عثمانی کو انقرہ میں ایک زبردست شکست دی۔ سلطان بایزید کو قید کر لیا۔ حلب اور دمشق وغیرہ پر قبضہ کیا۔ ۸۰۷ھ بمطابق ۱۴۰۵ء میں چین کو فتح کرنے کے ارادے سے نکلا تھا کہ راستے میں اترار کے مقام پر ستر برس کی عمر میں فوت ہوگیا۔

اگرچہ امیر تیمور کے انتقال کے بعد خاندانی جھگڑوں کی بدولت خاندان تیمور کی حکومت چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم ہوگئی، تاہم ابھی وہ پورے طور پر ختم نہ ہونے پائی تھی کہ بابر نے ہندوستان میں ایک ایسی حکومت کی بنیاد رکھی کہ تیموری سلطنت کو پھر سے زندہ کر دیا، جو ہندوستان میں تقریباً ساڑھے تین سو برس تک قائم رہی۔

سلطنتِ مغلیہ ہند کے بانی ظہیر الدین محمد بابر کا سلسلہ نسب پانچویں پشت میں امیر تیمور سے جا ملتا ہے۔ بابر ۸۸۸ھ بمطابق ۱۴۸۲ء

فرغانہ میں پیدا ہوا جہاں اس کا باپ عمر شیخ مرزا حکومت کرتا تھا۔ ۹۱۰ھ بمطابق ۱۵۰۴ء میں جب شیبانی ازبکوں نے فرغانہ وغیرہ پر قبضہ کر لیا تو بابر جان بچا کر افغانستان چلا آیا اور آتے ہی یہاں اپنی حکومت قائم کر لی۔

۹۰۹ھ بمطابق ۱۵۰۳ء میں بابر نے بدخشاں پر ۹۱۰ھ میں کابل پر اور ۹۱۲ھ بمطابق ۱۵۰۷ء میں قندھار پر قبضہ کر لیا۔ ۹۳۲ھ بمطابق ۱۵۲۵ء میں اس نے ترک فوج کے ساتھ پنجاب پر حملہ کیا اور لاہور پر قبضہ کر لیا۔

۷ رجب ۹۳۲ھ بمطابق ۲۰ اپریل ۱۵۲۶ء میں بابر نے پانی پت کے میدان میں ابراہیم لودھی کو شکست دے کر دہلی اور آگرے کو فتح کر لیا اور سلطنت مغلیہ ہند کا دامن دریائے اٹک سے بنگال تک پھیل گیا۔ بابر چاہتا تھا کہ بنگال، گجرات اور مالوہ بھی اس کی سلطنت کا حصہ بن جائے مگر موت نے اسے اتنی مہلت نہ دی اور ۹۳۷ھ بمطابق ۱۵۳۰ء میں بابر کا انتقال ہو گیا۔

بابر کے انتقال کے وقت ہمایوں صرف انیس برس کا تھا۔ وہی سلطنت مغلیہ کا جانشین ہوا۔ اگرچہ اس نے باپ کی آرزوؤں کی تکمیل کے لئے مالوہ اور گجرات پر حملہ کیا مگر کامیابی نصیب نہ ہو سکی۔ انہی دنوں بنگال کے افاغنہ شیر شاہ سوری کی سپہ سالاری میں مغل فوجوں کو برابر شکست پر شکست دیتے رہے حتیٰ کہ چونسا کے

مقام پر شیر شاہ سوری نے اچانک حملہ کر کے ہمایوں کی فوجوں کو بنگال سے نکال باہر کیا۔ اس کے علاوہ اس نے قنوج میں بھی ہمایوں کو شکست دی اور بالآخر گجرات کے سوا تمام ہندوستان پر قبضہ کر لیا۔

شیر شاہ سوری سے شکست کھانے کے بعد ہمایوں سندھ چلا آیا پھر یہاں سے موقع پا کر ایران پہنچ گیا۔ پندرہ سال گزر جانے کے بعد ہمایوں نے سوری افاغنہ سے انتقام لینے کے انتظامات مکمل کر لئے اس دوران میں شیر شاہ سوری فوت ہو چکا تھا اور اس کے نااہل جانشینوں کے سبب تمام ملک میں بدامنی پھیلی ہوئی تھی چنانچہ جب ہمایوں فوج لے کر ہندوستان کو چلا تو اس نے یہاں آتے ہی ایک ہی حملے میں دہلی کو فتح کر لیا۔

۱۵۵۶ء میں ہمایوں نے وفات پائی اور اس کے بعد جلال الدین اکبر اس کا نامور بیٹا چودہ برس کی عمر میں تخت نشیں ہوا۔ ۱۵۵۶ء میں، ہیمو بقال نے اکبر کو نوعمر اور ناتجربہ کار سمجھ کر پانی پت کے میدان میں مغلیہ فوجوں کے ساتھ اکبر کے خلاف معرکہ آرائی کی۔ جس کے نتیجے میں ہیمو نے شکست فاش کھائی اور قتل ہو گیا۔

اس کے بعد اکبر ہندوستان کے بہت بڑے حصے کا مالک بن گیا۔ غرض دہلی، آگرہ۔ گوالیار۔ جونپور۔ مالوہ۔ خاندیش۔ چتوڑ۔ گجرات۔ بنگال۔ کشمیر اور قندھار وغیرہ یکے بعد دیگرے فتح کیے۔ اس کے علاوہ اکبر نے بیجاپور اور گولکنڈہ کے بادشاہوں کو اپنا

خراج گزار بنا لیا۔ برار اور احمد نگر کے قلعے کو بھی فتح کیا۔
۱۶۰۵ء میں اکبر نے وفات پائی۔ اس کے بعد اس کا نامور بیٹا
جہانگیر اور اس کا بیٹا شاہجہاں جسے تعمیرات کا بیحد شوق تھا تخت نشین ہوا۔ شاہجہاں
کے عہد حکومت میں اورنگ زیب ۱۶۳۶ء سے ۱۶۴۴ء تک
دکن کے مفتوحہ علاقے کا حاکم رہا۔ جو چار قسمتوں میں تقسیم تھا۔ اوّل
دولت آباد اور احمد نگر۔ دوم خاندیش۔ سوم۔ تلینگانہ۔ چہارم۔ برار
اس کے علاوہ شاہ گولکنڈہ بھی اس کا باجگزار تھا۔

ولادت

اورنگ زیب دوحد کے مقام پر جو احمد آباد اور مالوہ کی سرحد پر واقع ہے ۱۰۲۸ھ (۱۶۱۸ء) میں پیدا ہوا۔ کسی شاعر نے اس کی تاریخ ولادت "آفتاب عالمتاب" نکالی ہے۔ جو فی الحقیقت اسم بامسمیٰ ہے۔

جن اساتذہ سے اورنگ زیب نے تعلیم و تربیت پائی ان میں اسداللہ خاں وزیر اعظم شاہجہاں۔ ملّا صالح۔ محمد ہاشم گیلانی۔ مولوی عبداللطیف سلطانپوری۔ ملا محی الدین اور شیخ احمد عرف ملا جیون وغیرہ ممتاز علماء کے اسمائے گرامی خاص کر قابل ذکر ہیں۔ اورنگ زیب نے ابتدائی سن ہی میں تفسیر، حدیث اور فقہ میں کامل مہارت حاصل کرلی تھی۔ اس کے علاوہ اس نے امام غزالی کی تصنیفات کا بھی مطالعہ کیا تھا۔

اورنگ زیب عالمگیر جوانی سے لے کر بڑھاپے تک نہایت

زاہد و مرتاض اور متقی و پرہیزگار ثابت ہوا حتیٰ کہ بلا خوف تردید وہ کبھی کسی حرام اور گناہ میں مبتلا نہیں ہوا۔ ہر چند کہ وہ اسلامی ہند ایسی وسیع و عریض سلطنت کا تنہا مالک تھا لیکن اس کے باوجود وہ حکومت کے نشے میں بھی کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔

مختصراً یہ کہ تھوڑی ہی مدت میں اورنگ زیب عالمگیر نے جملہ علوم و فنون میں کامل دستگاہ پائی۔ عربی، فارسی، ترکی اور ہندی زبان میں مکمل مہارت حاصل کی۔ عربی اور فارسی خط یعنی نسخ اور نستعلیق میں بھی کمال حاصل کیا۔ اس کے ساتھ فنون حربیہ، ملکی آئین، طریق جہانبانی اور دستور فرمانروائی کا وہ بہترین سلیقہ حاصل کیا کہ باوجود کم عمری کے صوبجات دکن ایسے پُر آشوب صوبوں کی کامیابی کے ساتھ گورنری کی۔ اس وقت اورنگ زیب کا سن صرف اٹھارہ برس کا تھا جب وہ دکن کا گورنر مقرر ہوا۔

اورنگ زیب عالمگیر بچپن ہی سے دلیر اور شجاع واقعہ ہوا تھا۔ اس کی بہادری اور شجاعت کا کچھ اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ۲۹ ذیقعدہ ۱۰۴۲ھ بمطابق ۲۸ مئی ۱۶۳۳ء کی صبح کو شاہجہان شاہان مغلیہ کی دیرینہ رسم کے مطابق مست ہاتھیوں کی لڑائی کا تماشا دیکھنے کے لئے قلعہ آگرہ کے جھروکے میں بیٹھا ہوا تھا۔ دریا کے کنارے دو مست ہاتھی لڑنے کے لئے چھوڑے گئے۔ دارا، شجاع اور عالمگیر اپنے گھوڑوں پر سوار میدان میں کھڑے تماشا

دیکھ رہے تھے کہ صورت سُندر نامی ہاتھی ایک طرف کو بھاگ نکلا۔
سدھکر نامی ہاتھی نے اس کا پیچھا کیا مگر حریف دور نکل چکا تھا۔ اس لئے
ہاتھی نے بدمست ہو کر مجمع کا رُخ کیا۔ سب سے آگے عالمگیر کا گھوڑا
تھا۔ مجمع گھبرا کر وہاں سے بھاگ نکلا، مگر اورنگ زیب پہاڑ کی
طرح وہیں کھڑا رہا اور تلوار سے ایک ایسا بھرپور وار کیا۔ کہ
ایک ہی وار میں ہاتھی کی سونڈ کاٹ ڈالی اس دوران میں ہاتھی کا
مدمقابل ہاتھی بھی آگیا اور عالمگیر کو اس مہم سے فراغت مل گئی۔ عالمگیر
کی عمر اس وقت چودہ برس کی تھی۔ شاہجہان نے فرط محبت سے
اس کو سینے سے لگالیا اور غریبوں میں خیرات تقسیم کی گئی۔

اورنگ زیب کی طبیعت میں جہاں زہد و اتقا درجہ کمال
کو پہنچا ہوا تھا وہاں ساتھ ہی ساتھ شجاعت و بہادری کا بہرہ
وافر بھی حاصل تھا اس نے شاہزادگی کے زمانے ہی میں بلخ اور بدخشاں
کو فتح کر لیا تھا۔ قندھار اور دکن کی مہم بھی سر کر لی تھی اس کے
علاوہ ایک مست ہاتھی سے بھی دست بدست جنگ کرنا اس کے
عہد جوانی کا مشہور واقعہ ہے۔ اور اس سے ایک اندازہ ہوتا ہے
کہ اورنگ زیب کس قدر بہادر اور جری تھا۔

بالخصوص وہ لڑائیاں جو شاہجہاں کی بیماری کے زمانے میں
برپا ہوئیں اور اورنگ زیب کو ایک سال کی مدت میں کوئی چار
پانچ مرتبہ اپنے دشمنوں سے لڑنا پڑا بڑی گھمسان کی جنگ ہوئی

ہر چند وہ کبھی کبھی مغلوب ہو جاتا لیکن ایسی پامردی اور استقلال دکھاتا کہ دوست دشمن سبھی اس کی بہادری اور استقامت کے معترف ہوئے بغیر نہ رہ سکتے ۔ نہایت قابل ذکر ہیں ۔

افسوس کہ بعض امور ملکی و سیاسی میں جو اس کی زاہدانہ طبیعت سے ہرگز میل نہیں کھاتے وہ سخت بدنام ہوا ہے ۔ مثلاً باپ کو قید کیا ۔ بھائیوں کو قتل کروا دیا ۔ دکن کی اسلامی ریاستوں کو مٹا ڈالا ۔ بت خانے ڈھا کر ہندوؤں سے ناراضگی مول لی اور آخر میں یہ کہ مرہٹوں سے چھیڑ چھاڑ کر کے سلطنت مغلیہ کی تباہی و بربادی کے سامان پیدا کر دیئے

درحقیقت اورنگ زیب کی فرد قرارداد جرم بھی انہیں حصوں میں سے ایک حصہ ہے ۔ جن کا اصلیت سے کوئی تعلق نہیں ، صرف انگریز اور ہندو مؤرخوں نے سیاسی مصلحتوں کے لئے اسے افسانۂ بزم و انجمن بنا دیا اور بس !

واقعات کا اجمال یہ ہے کہ شاہجہاں کی چہیتی بیوی (نور جہاں کی بھتیجی) ممتاز محل کے بطن سے کل چودہ بچے پیدا ہوئے ، جن میں سات بچے زندہ رہے ۔ ان میں چار بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں ۔ جہاں آرا عرف بیگم صاحب سب سے بڑی بیٹی تھی اس سے چھوٹی روشن آرا اور اس سے چھوٹی بیٹی گوہر آرا تھی ۔

شاہجہاں کا بڑا بیٹا جو بے حد لاڈلا تھا دارا شکوہ تھا یہ ۱۶۱۵ء

میں اجمیر میں پیدا ہوا۔ اس سے چھوٹا محمد شجاع تھا جو ۱۶۱۶ء میں اجمیر میں پیدا ہوا۔ شجاع سے چھوٹا اورنگ زیب عالمگیر تھا، جو ۱۶۱۸ء میں دوحد کے مقام پر پیدا ہوا۔ پھر اس سے چھوٹا بیٹا مراد تھا جو ۱۶۲۴ء میں تہاس میں پیدا ہوا۔

دارا شکوہ چونکہ باپ کا منظور نظر اور لاڈلا تھا۔ اس وجہ سے ہر وقت شاہجہاں کے ساتھ رہتا تھا وہ اسے کبھی اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتا تھا۔ یہی سبب ہے کہ قندھار کی مہم میں شریک ہونے کے سوا دارا شکوہ کو کبھی کسی مہم پر جانے کا موقع نہیں ملا۔

شاہجہاں کے دیگر بیٹے جو دارا شکوہ کی طرح محبوب نہیں تھے۔ وہ مختلف صوبوں میں گورنر بنا کر بھیج دیئے گئے۔ ان میں ایک تو شجاع تھا جو پہلے تو دکن کا گورنر مقرر ہوا پھر بنگال بھیج دیا گیا جہاں وہ بیس برس تک صوبے کا حاکم رہا۔ اس کے علاوہ صوبہ اڑیسہ بھی اس کے ماتحت رہا۔ دوسرا اورنگ زیب تھا جو دکن کی صوبیداری پر مامور تھا۔ اور مراد احمد آباد گجرات میں حاکم تھا۔

جس زمانے میں شاہجہاں بیمار پڑا یہ غالباً ۱۰۶۷ء کا واقعہ ہے اور اورنگ زیب اپنے باپ کے حکم کی تعمیل میں بیجاپور کے محاصرے میں لگا ہوا تھا۔ دارا شکوہ جو شاہجہاں کی نظر میں پسندیدہ اور اس کا محبوب پسر تھا اپنی حیثیت سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے سلطنت کے کل سیاہ وسفید کا مالک بن بیٹھا۔

یہ صورت حال جب محمد شجاع نے دیکھی تو اس نے اور مراد نے اپنی اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ خاص کر مراد نے تو اپنے نام کا سکّہ و خطبہ بھی جاری کر دیا۔

محمد شجاع ایک لشکر جرار لے کر پٹنہ پہنچ گیا۔ پھر یہاں سے ہوتا ہوا بہار و بنگال پہنچ گیا اور دارا شکوہ کا مقابلہ کرنے کے لئے پَر تول لئے۔ ۴ ربیع الاول ۱۰۶۸ھ کو دارا شکوہ نے راجہ جے سنگھ و دیگر چند ایک امراء کو بھاری لشکر دے کر محمد شجاع کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا۔ بنارس کے قریب راجہ جے سنگھ اور محمد شجاع کی فوجوں کے درمیان گھمسان کی جنگ ہوئی جس میں محمد شجاع کو شکست ہوئی، اور وہ جان بچا کر بنگال کو بھاگ نکلا۔ اور وہیں جا کر دم لیا ادھر میدان راجہ جے سنگھ کے ہاتھ رہا۔

اگرچہ اورنگ زیب عالمگیر کو ان تمام حالات کی دکن میں برابر خبریں پہنچ رہی تھیں اور اسے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ دارا شکوہ نے اپنے امراء مہاراجہ جسونت سنگھ اور قاسم خاں وغیرہ کو تاکید کر دی ہے کہ جونہی انہیں عالمگیر کی کسی نقل و حرکت کا پتہ چلے فوراً وہیں اس کا راستہ روک کر کھڑے ہو جائیں۔ لیکن اورنگ زیب حالات کا نہایت صبر و سکون سے مطالعہ کر رہا تھا اور موقع کا منتظر تھا۔

اورنگ زیب کو اس بات کا بھی علم ہو چکا تھا کہ مراد نے سکّہ و خطبہ اپنے نام کا جاری کر لیا ہے اور اب سورت کے قلعے

پر قبضہ جمانے کے ارادے ہو رہے ہیں۔ لیکن اورنگ زیب نے دارا شکوہ یا اپنے باپ شاہجہاں کے خلاف کسی تخریب اور سازش میں کوئی حصہ نہیں لیا۔

ہر چند اورنگ زیب ان تمام باتوں سے الگ رہا جو محمد شجاع اور مراد وغیرہ کی طرف سے عمل میں آ رہی تھیں تاہم وہ اپنی گوناگوں خوبیوں اور صلاحیتوں کے سبب دارا شکوہ کی نگاہوں میں برابر کھٹک رہا تھا۔ یہی سبب ہے کہ اس نے شاہجہاں کو عالمگیر کے خلاف بھڑکایا جس کے نتیجے میں عالمگیر کو اپنی خداداد شجاعت سے اپنے مخالفوں پر غالب آکر شاہجہان کو نظر بند کرنا پڑا۔

نظر بندی

دراصل انگریز اور ہندو مؤرخوں نے مسلمان حکمرانوں کو نگاہوں سے گرانے اور آنے والی نسلوں کے دلوں سے ان کی توقیر مٹانے کے لئے ان پر طرح طرح کے بے سر و پا الزامات عائد کئے ہیں۔ بات کا بتنگڑ یا رائی کا پہاڑ بنانے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا، درحقیقت شاہجہاں کو قید کرنے کا الزام بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے، جس میں کچھ اصلیت نہیں۔

کہا جاتا ہے شاہجہاں نے جب اپنا بڑھاپا دیکھا تو اپنی اولاد کو باہمی جنگ و جدال سے بچانے کے لئے انہیں اپنی زندگی ہی میں چار الگ الگ صوبوں پر فائز کر دیا، پھر وہ اس واقعے کے

کوئی دو چار سال بعد ستّر برس کی عمر کو پہنچا تو اچانک ۱۰۶۷ھ میں حبس بول کے مرض میں مبتلا ہو گیا۔ دارا شکوہ جو شاہجہاں کا سب سے بڑا اور لاڈلا بیٹا تھا باپ کو مرض کی وجہ سے بے دست و پا دیکھ کر مسند نشین ہو گیا۔ اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ مراد، شجاع اور عالمگیر سے باپ کی بیماری چھپانے کے لئے ان سفیروں سے جو اس کے ان تین بھائیوں سے متعلق تھے اور یہاں دربار میں شاہجہاں کے پاس رہتے تھے مچلکے لے لئے، مقصد جس کا یہ تھا کہ وہ دربار کی کوئی خبر نہ بھیجنے پائیں۔

لیکن شاہجہاں کی بیماری کوئی ایسا واقعہ تو نہ تھا جو چھپائے چھپ جاتا۔ بالآخر سلطنت کے تمام صوبوں میں کسی نہ کسی طرح اطلاع پہنچ ہی گئی اور تمام ملک دفعتہً فتنوں اور بغاوتوں کی لپیٹ میں آ گیا۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ سب سے پہلے شجاع نے بنگال کے صوبے میں اپنی بادشاہی کا اعلان کیا پھر اس کے بعد مراد بخش نے احمد آباد گجرات میں اپنے نام کا سکّہ اور خطبہ جاری کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان کیا لیکن اس کے برعکس اورنگ زیب نے جو شجاع سے عمر میں چھوٹا اور مراد بخش سے بڑا تھا خود سری اور بغاوت کا کوئی مظاہرہ نہیں کیا۔

عالمگیر ان ایام میں گلبرگہ کی مہم میں مصروف تھا اور قریب تھا

کہ فتح پالے کہ اچانک اسے اور اس کے لشکر کے سرداروں کے نام دارا شکوہ نے شاہجہاں کی طرف سے حکم بھجوایا جس کا مضمون یہ تھا کہ عالمگیر اس مہم کو چھوڑ دے اور عالمگیر کے ساتھی عالمگیر کا ساتھ چھوڑ کر فوراً دربار میں چلے آئیں۔ چنانچہ امراء نے دربار کی راہ لی اور اُدھر اورنگ زیب کو بادل ناخواستہ والیٔ بیجاپور سے ایک کروڑ روپیہ لے کر اس مہم کو نامکمل چھوڑنا پڑا۔

دارا شکوہ نے صرف یہی نہیں کیا کہ سرداروں کو واپس بلالیا، بلکہ عالمگیر کے سفیر کو قید کر کے اس کا مال واسباب اور گھر بار بھی ضبط کر لیا۔ اس کی خطا صرف یہ تھی کہ وہ عالمگیر کا سفیر تھا۔ اس کے علاوہ دارا شکوہ نے جسونت سنگھ والیٔ جودھپور کو فوج اور خزانہ دے کر عالمگیر سے معرکہ آرائی کے لئے بھیج دیا۔

عالمگیر جمادی الاوّل کے مہینے کی بارھویں تاریخ کو ۱۰۶۸ھ میں یعنی شاہجہاں کی بیماری کے پانچویں مہینے بیجاپور سے چل کر برہان پور پہنچا، وہ یہاں کوئی ایک مہینے تک ٹھہرا۔ پھر یہاں سے چل کر ۲۰ رجب ۱۰۶۸ھ کو دیبال پور پہنچ گیا۔ جہاں پہلے سے طے شدہ منصوبے کے مطابق مراد بخش بھی اس سے آملا۔ جب جسونت سنگھ کو پتہ چلا کہ عالمگیر آچکا ہے تو وہ بھی فوجیں لے کر آگے بڑھا اور عالمگیر کے پڑاؤ سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر خیمے ڈال دیئے۔

عالمگیر نے مشہور بھاکا شاعر کب کلس کو راجہ کے پاس کہلا بھیجا کہ

ہم والد ماجد کی عیادت کے لئے جا رہے ہیں تم خواہ مخواہ ہمارا راستہ روک کر ہم سے نہ الجھو لیکن راجا نہ مانا آخر کار معرکہ ہوا جس میں راجا نے شکست کھائی اور اپنے وطن کی طرف بھاگ نکلا۔

اس دوران میں شاہجہاں آگرے سے دہلی جا رہا تھا کہ اسے جسونت سنگھ کے شکست کھانے کی اطلاع ملی۔ ہر چند آگرے کی آب و ہوا شاہجہاں کے مزاج کے خلاف تھی لیکن وہ داراشکوہ کے ہاتھوں مردہ بدست زندہ کے مصداق مجبور تھا اور آگرے چلا آیا۔ اب شاہجہاں کو آگرے پہنچانے کے بعد داراشکوہ ساٹھ ہزار فوج لے کر عالمگیر کے مقابلے کیلئے خود چل دیا۔ ہر چند شاہجہاں نے اسے بہتیرا سمجھایا کہ تمہارا جانا مناسب نہیں لیکن وہ ارادے سے باز نہ آیا۔

۱۰۶۸ھ میں سموگڑھ کے مقام پر اورنگ زیب عالمگیر اور داراشکوہ کے درمیان سخت خونریز جنگ ہوئی جس میں عالمگیر کامیاب ہوا داراشکوہ جان بچا کر آگرے کو بھاگ نکلا۔ ہر چند شاہجہاں نے صلاح و مشورہ کے لئے اسے بار بار بلایا لیکن وہ شرم کے مارے شاہجہاں کے پاس نہ جا سکا۔ آخر اسی رات اپنے بیوی بچوں کو ساتھ لے کر لاہور کے ارادے سے دہلی جا پہنچا۔

اس حال میں جبکہ داراشکوہ سخت مایوسی اور ناامیدی میں مبتلا تھا اور وہ الفاظ جو شاہجہاں نے اسے لڑائی پر جاتے ہوئے کہے تھے کہ "یاد رکھو اگر لڑائی بگڑ گئی تو مجھے پھر آ کر کیا منہ دکھاؤ گے"

داراشکوہ کو برابر یاد آرہے تھے ،، اس لیئے وہ شکست کھانے کے بعد شرم کے مارے شاہجہاں کے پاس نہ جاسکا۔ لیکن شاہجہاں نے بہرکیف ایک وفادار خواجہ سرا کی زبانی اس بدنصیب کو تسکین اور تسلی کے لیئے یہ کہلا بھیجا کہ میں اب بھی تمہیں ویسا ہی چاہتا ہوں اور تمہاری اس مصیبت کا مجھے بے حد رنج ہے بلکہ یہ بھی کہلا بھیجا کہ ابھی سلیمان شکوہ کی فوج اور لشکر سب صحیح سلامت ہے ناامید ہونے کی کوئی بات نہیں۔ ہماری صلاح ہے کہ تم دہلی چلے جاؤ۔ صوبیدار کو حکم بھیج دیا گیا ہے کہ وہ تمہیں بادشاہی اصطبل میں سے ایک ہزار گھوڑے۔ خزانہ اور ہاتھی دیدے۔ اور آگرے سے دور نہ جانا —— بلکہ ایک ایسے معقول فاصلے پر ٹھہرنا مناسب ہے کہ جہاں ہماری تحریریں تمہیں بآسانی ملتی رہیں۔ اور ہمیں اب تک یہ امید ہے کہ ہم اورنگ زیب پر "قابو پاسکیں گے، بلکہ اُسے کڑی سزا بھی دے سکیں گے۔

اب داراشکوہ کے ارادے عالمگیر پر بالکل ظاہر ہوچکے تھے اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ شاہجہاں اسے بے حد چاہتا ہے اور اس کی دلی خواہش ہے کہ وہی اس کے بعد بادشاہ بنے لہٰذا عالمگیر نے گرد و پیش کا جائزہ لینے اور حالات پر نظر رکھتے ہوئے اپنے بیٹے شہزادہ محمد سلطان کو ۱۰۶۸ھ رمضان کے مہینے کی سترھویں تاریخ کو روانہ کیا کہ جاکر قلعے پر قبضہ کرلے اور شاہجہاں کی خدمت میں ادب سے عرض کرے کہ حضور اب قلعہ سے باہر تشریف نہ لائیں، غرض یہ وہ آخری واقعہ ہے جسے عالمگیر

toobaa-elibrary.blogspot.com

کے مخالفین لے اڑے اور دشمنان اسلام نے اسے نمک مرچ لگا کر جس طرح پیش کیا اس سے لوگوں میں یہ بات مشہور ہوگئی کہ عالمگیر نے اپنے باپ کا ذرا لحاظ نہ کیا بلکہ تخت و تاج کی ہوس میں اندھا ہو کر اسے قید کر دیا حالانکہ اسے ہرگز قید نہیں کیا گیا، بلکہ امن عامہ کو فتنہ و فساد سے بچانے کے لئے شاہجہاں کو صرف اتنی سی بات کا پابند بنایا گیا تھا کہ وہ حالات کے سازگار ہونے تک قلعہ سے باہر تشریف نہ لے جائیں اسے زیادہ سے زیادہ نظربندی کہا جا سکتا ہے۔ قید کرنا ہرگز صحیح نہیں۔ پھر ایسے عالم میں جبکہ شاہجہاں کی عمر ستر برس سے اوپر ہو چکی تھی۔ اس کا تخت و تاج کے مسائل سے تعلق رکھنا مناسب ہو سکتا تھا۔

۱۔ پہلی بات یہ ہے کہ آخر عمر میں شاہجہاں مکمل طور پر داراشکوہ کے قبضے میں آچکا تھا وہ جو چاہتا سو کرتا تھا۔ اسے کوئی ٹوکنے والا نہ تھا۔ خود شاہجہاں کی حیثیت بھی اس کے سامنے مردہ بدست زندہ کی تھی۔

۲۔ داراشکوہ نے شاہجہاں کی بیماری سے نہ صرف عالمگیر بلکہ اپنے تمام بھائیوں کو بے خبر رکھنے کی کوشش کی۔

۳۔ بنگال، گجرات اور دکن کے تمام راستے بند کرا دیئے تاکہ مسافروں کے ذریعے سے بھی کسی کو خبر نہ ہونے پائے کہ شاہجہاں بیمار ہے۔

۴۔ عالمگیر کے سفیر کا مال و اسباب اور گھر بار ناحق ضبط کر لیا، اور اسے قید کر دیا۔

۵۔ بیجاپور کے محاصرے میں جتنے افسر عالمگیر کے ساتھ مشغول تھے

انہیں شاہجہاں کے حکم کا حوالہ دے کر واپس بلا لیا۔

۶۔ بغیر اس کے کہ کسی شاہزادے کی طرف سے پیش قدمی ہو عالمگیر کے مقابلے کیلئے فوجیں دے کر جسونت سنگھ کو بھیج دیا۔

غرض یہ ہیں وہ تمام باتیں جو دارا شکوہ نے اس گھمنڈ پر عالمگیر سے روا رکھیں کہ وہ شاہجہاں کا چہیتا فرزند اور ولی عہد سلطنت ہے اور اس لحاظ سے کہ شاہجہاں کو دارا شکوہ بے حد عزیز ہے اور اس کے لئے وہ ہر جائز و ناجائز کو روا رکھتا ہے۔ اورنگ زیب کے سامنے فقط ایک ہی راستہ تھا کہ وہ اپنے بوڑھے باپ کو قلعہ میں بٹھا کر اس کبر سنی میں سلطنت کے معاملات میں دخیل ہونے سے روک دے۔

اب رہی بات بھائیوں کے خون سے ہاتھ رنگنے کی۔ ڈاکٹر برنیر جو عالمگیر کا سب سے بڑا دشمن ہے اس واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یوں لکھتا ہے:

"واقعی انہیں اپنے اس ارادے سے دست بردار ہونا مشکل تھا، کیونکہ فتح پانے کی صورت میں تو ضرور تخت کی امید تھی۔ لیکن شکست کھانے کی حالت میں موت یقینی تھی۔ اب صرف دو ہی باتیں تھیں۔ موت یا سلطنت اور جس طرح شاہجہاں خاص اپنے بھائیوں کے خون سے ہاتھ رنگین کر کے تخت پر بیٹھا تھا۔ اسی طرح انھیں بھی بکمل یقین تھا کہ اگر ہم اپنی امیدوں میں ناکام رہے

تو فتح پانے والا حسد کے مارے ہمیں ضرور قتل کرا دے گا۔"

لین پول یوں لکھتا ہے:

"اورنگ زیب ضرور جانتا ہو گا کہ بھائیوں میں کسی ایک کی تخت نشینی سے یا تو وہ قید کر لیا جائے گا یا قتل کر دیا جائے گا۔ اور اس نے اپنے دل میں پختہ ارادہ کر لیا ہو گا اور حفاظتِ خود اختیاری میں اس کا فرض تھا کہ بادشاہت کے حصول کیلئے وہ بھی ایک نیلامی بولی بولے۔"

فی الواقع باپ کی نظر بندی اور بھائیوں کے قتل کا محرک اصلی صرف ایک ہی ہے یعنی حصول بادشاہت کیلئے جو تگ و دو ہو رہی تھی۔ شاہجہاں چاہتا تھا کہ اس میں داراشکوہ اس کے لاڈلے بیٹے کا پلہ بھاری رہے۔ ادھر داراشکوہ کے بھائیوں میں ہر کسی کی خواہش یہی تھی کہ قرعۂ فال اسی کے نام کا نکلے۔ بالآخر عالمگیر غالب آیا۔ بھائی قتل ہو گئے اور باپ کو نظر بند کر دیا گیا۔

داراشکوہ کی فردِ جرم پیش کی جا چکی ہے اور اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دونوں میں خطاوار کون تھا۔ داراشکوہ یا عالمگیر؟ دونوں میں سے بات بڑھانے اور لڑنے کی پہل کس نے کی داراشکوہ نے یا عالمگیر نے، پھر ان دونوں میں جو معرکہ آرائی ہوئی اس میں حفاظتِ خود اختیاری کے تحت کون لڑا داراشکوہ یا عالمگیر؟

ممکن ہے عالمگیر کا کوئی مخالف یہ اعتراض اٹھائے کہ جب عالمگیر نے جسونت سنگھ کو شکست دی اور آگرے کے قریب پہنچا تو وہ شاہجہاں کے پاس کیوں نہ گیا۔ حالانکہ شاہجہاں بار بار بلاتا رہا۔ اس نے بہت شفقت آمیز خطوط لکھے، تحفے تحائف اور انعامات بھیجے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ سلطنت کی تقسیم اس طریقے پر کرنی چاہتا تھا کہ اس سے بڑھ کر عالمگیر کے حق میں کوئی بات نہ ہو سکتی تھی۔ یعنی یہ کہ دارا شکوہ کو پنجاب اور کابل، مراد بخش کو گجرات، شجاع کو بنگال اور عالمگیر کو دلی عہد بنا کر پایہ تخت کی حکومت و سلطنت دے دی جائے۔ لیکن اس پر بھی عالمگیر نہ باپ کے پاس گیا نہ اسے قلعہ میں قید کرنے کے ارادے سے رکا۔ سوال یہ ہے کہ کیا شاہجہاں جیسا کہتا تھا واقعی اسی طرح کرنا چاہتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ دارا شکوہ کی محبت میں اندھا ہو چکا تھا، اور اس لئے عالمگیر کو فریب دیتا تھا۔ اس کا واضح ثبوت اس واقعہ سے مل جاتا ہے جو شاہجہاں کا عالمگیر کو درد انگیز خط یہ خط لکھ کر اپنے پاس بلانے کے بارے میں ہے۔ عین اس وقت کہ عالمگیر اپنے باپ کے درد انگیز خطوط سے بیتاب ہو کر شاہجہاں سے ملاقات کو نکلا تو اسے شاہجہاں کی ایک چھٹی ہاتھ آئی جو دارا شکوہ کے نام تھی۔ جس کا مضمون یہ تھا۔ کہ تم ابھی مطمئن ہو کر دہلی سے آگے نہ بڑھو۔ وہیں ٹھہرو، ہم یہیں قصہ پاک کئے دیتے ہیں۔ اس چھٹی سے عالمگیر کے ان خیر خواہوں کی اطلاعات کی حرف بحرف تصدیق ہو گئی جنہیں شاہجہاں کی طرف سے

فتنہ پرداز اور مفسد کہا جاتا تھا۔ چنانچہ عالمگیر نے شاہجہاں سے ملنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

ڈاکٹر برنیئر لکھتا ہے۔ شاہجہاں نے ایک معتبر خواجہ سرا کو اورنگ زیب کے پاس یہ کہلا کر بھیجا کہ بے شک دارا شکوہ نے جو کچھ کیا سب نامناسب تھا اور اس کی بے سمجھی اور نالائقی کی باتیں یاد دلا کر کہا ہمیں تم سے تو ابتداء ہی سے محبت اور دلی شفقت ہے۔ پس تمہیں ہمارے پاس جلد آنا چاہیئے، تاکہ تمہارے مشورے سے ان امور کا جلد انتظام کیا جائے جو اس افراتفری کے باعث رُکے پڑے ہیں۔ لیکن اس محتاط شہزادے یعنی عالمگیر نے بدگمانی سے بادشاہ پر نظر رکھتے ہوئے قلعے میں جانے کی ہمت نہ کی۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ جہاں آرا بیگم عرف بیگم صاحب جو دارا شکوہ کی بڑی طرف دار ہے کسی وقت بھی بادشاہ سے علیحدہ نہیں ہوتی اور اس کے مزاج پر اس قدر حاوی ہے کہ جو کچھ وہ چاہتی ہے، وہی ہوتا ہے۔ اور یہ پیغام ایک چکمہ ہے جو اسی کی طرف سے دیا جا رہا ہے۔ اس نے قلماقینوں یعنی تاتاری عورتوں میں سے جو محل سرا کے چوکی پہرے پر مقرر ہیں کچھ قوی ہیکل اور مضبوط اور مسلح عورتیں اس ارادے سے منگوا رکھی ہیں کہ جونہی وہ (عالمگیر) قلعے میں داخل ہو یہ اس پر ٹوٹ پڑیں۔

ان واقعات سے یہ امر قطعی واضح ہو گیا کہ اورنگ زیب قلعے میں نہ جانے اور دارا شکوہ کے قتل کو لازم قرار دینے میں حق بجانب تھا۔ واقعہ

یہ ہے کہ داراشکوہ جب تک زندہ رہتا سازشیں اور بغاوتیں ہمیشہ برپا رہتیں۔ اور ملک میں کبھی امن وسکون پیدا نہ ہوتا لہٰذا عالمگیر نے امن عامہ کو فتنہ وفساد سے بچانے اور ملک میں امن وامان قائم رکھنے کے لیئے وہی قدم اٹھایا جو شاہجہاں نے اپنے بھائیوں کے خلاف اٹھایا تھا یعنی داور بخش اور شہریار اور ہوشنگ وغیرہ اس کے بھائی اور بھتیجے خاص شاہجہاں کے حکم ہی سے قتل کیئے گئے۔ چنانچہ داراشکوہ بھی خاص عالمگیر ہی کے حکم سے قتل کیا گیا۔

مخالفت کے اسباب

داراشکوہ جو ۲۹ صفر ۱۰۲۴ھ کو پیدا ہوا عربی اور فارسی زبان پر اصل زبان کی طرح عبور رکھتا تھا اور سنسکرت کی تعلیم اس نے بہترین پنڈتوں سے بنارس میں رہ کر حاصل کی۔ اسے عالمگیر سے کیوں مخالفت تھی اس سلسلے میں صاحب مقدمہ رقعات عالمگیر مخالفت کے اسباب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں داراشکوہ چونکہ شاہجہاں کا سب سے بڑا بیٹا تھا اس لئے سب سے زیادہ پیارا تھا۔ پھر ماں باپ کے لاڈ پیار، درباریوں کی خوشامد، غلط تعریف اور خود شاہجہاں کی انتہائی محبت نے اسے خودسر، خودرائے اور ستائش پسند بنا دیا تھا۔ وہ سمجھنے لگا تھا کہ تمام حکومت میں اس سے زیادہ صائب الرائے، عقلمند، وسیع المشرب، اور صاحب اقتدار کوئی نہیں۔ اس لئے جب اس کے دوسرے بھائی سن شعور کو پہنچے، اپنے درجے، مرتبے اور کاموں کے سبب لوگوں کو اپنی طرف

متوجہ کرنے لگے تو اسے یہ بات نہایت ناگوار معلوم ہوئی، اور چوں کہ اورنگ زیب ان میں سب سے زیادہ بااثر، عقلمند، دوراندیش اور سب سے زیادہ کامیاب تھا اس لئے داراشکوہ کو اس سے خواہ مخواہ عداوت پیدا ہوگئی۔ اور جوں جوں اورنگ زیب ترقی کرتا اور لوگوں کے دلوں میں اپنی جگہ بناتا جاتا۔ دارا کی دشمنی اس کی سازشیں اس کے خلاف بڑھتی جاتی تھیں۔

۳، ذی الحجہ ۱۰۴۵ھ میں عالمگیر کو صوبہ جات دکن کا گورنر بنایا گیا جس پر وہ آٹھ سال تک متعین رہا۔ اس دوران میں اس نے جو امور سرانجام دیئے ان سے اس کے انتظامات ملکی کی صلاحیتوں کا پتہ چلتا ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس پایہ کا مدبر، منتظم اور اعلیٰ حکمران تھا۔

۵، شوال ۱۰۵۴ھ میں صوبہ گجرات کی گورنری دی گئی۔ ایک سال چند ماہ گزرنے کے بعد بلخ و بدخشاں کی جنگ پر مامور کردیا گیا۔ جہاں پہلے شاہزادہ مراد کو بھیجا گیا مگر اس کی نااہلی اور ناعاقبت اندیشی سے دشمن کو بڑی تقویت پہنچی اس پر اسے واپس بلا لیا گیا اور اس کی جگہ عالمگیر کو بھیجا گیا۔ جس نے بڑی ہوشیاری اور عقلمندی کے ساتھ اس مہم کو سر کیا۔ سچ پوچھئے تو یہ لڑائی بھی اورنگ زیب کی پاکیزگی اور طہارت ہی نے جیتی۔ کہتے ہیں کہ عین لڑائی میں ظہر کی نماز کا وقت آ گیا تو عالمگیر نے فوراً ظہر کی جماعت کا حکم دیدیا۔ ہر چند خیر خواہوں نے تجویز پیش کی کہ اس وقت معرکہ بہت سخت ہے۔ مگر عالمگیر

کے پائے استقلال میں ذرا سی بھی لغزش نہ آئی۔ اس نے بڑے اطمینان سے نماز ادا کی۔ اسے نہ کوئی خوف تھا نہ ڈر۔ جب اس واقعہ کی اطلاع عبدالعزیز خاں والئ بلخ کو پہنچی تو اس نے عالمگیر کے عزم و حوصلہ اور پاکیزگی و طہارت کو دیکھ کر صلح کی درخواست پیش کی جسے عالمگیر نے قبول کر لیا۔

دس برس کے بعد جب دکن کے احوال بہت بگڑ چکے تھے حتیٰ کہ اس کی آمدنی صرف ایک کروڑ رہ گئی تھی۔ حالانکہ اس سے پہلے اسی صوبے کی آمدنی تین کروڑ باسٹھ لاکھ تھی تو دارا نے اس چال سے کہ اورنگ زیب جس کا وقار ہر میدان میں بڑھتا جا رہا ہے اسے مصائب میں مبتلا کرنے کے لئے پھر دکن کا گورنر بنا کر بھیج دیا جائے۔ چنانچہ وہ شاہجہاں سے کہہ کر عالمگیر کو دوبارہ دکن بھجوانے میں کامیاب ہو گیا۔ عالمگیر کے لئے یہ نازک موقع بڑی آزمائش کا تھا۔ ایک طرف تو اس کے خلاف شاہجہاں کے کان بھرے جاتے تھے اور شاہجہاں نے ان سے متاثر ہو کر ایسی ایسی نکتہ چینیاں کرنی شروع کر دیں کہ جن کے تصور ہی سے ہنسی آتی ہے۔ دوسری طرف وہ دکن کی جنگی مہمات میں دشمنوں سے گھرا ہوا تھا۔ وہ دشمنوں بالخصوص مرہٹوں کا استیصال کرنے کیلئے سردھڑ کی بازی لگاتا۔ ہزاروں جانیں اور کروڑوں روپیہ برباد کرنے کے بعد مرہٹوں اور دکن کی ریاستوں کے باغیوں پر قابو پانے میں کامیابی حاصل کرتا لیکن دارا کی دشمنوں کے ساتھ عالمگیر کے خلاف

خفیہ سازباز اس کے تمام کیے کرائے پر پانی پھیرتی رہی۔ دارا کا مقصود اس سے یہ تھا کہ عالمگیر کے لئے ایسے احوال پیدا کردیئے جائیں کہ وہ ایک طرف شاہجہاں سے بغاوت کرنے پر مجبور ہوجائے اور دوسری طرف دکن کی جنگی مہمات کے سَر کرنے میں ناکام رہے جس سے یہ ثابت ہو کہ وہ شاہجہاں کے حکم کی تعمیل کرنے کا اہل نہیں۔

کیفیت یہ تھی کہ مرہٹے میدانِ جنگ میں مردوں کی طرح کبھی ڈٹ کر نہیں لڑتے تھے۔ وہ جب دیکھتے کہ ان کی شکست یقینی ہے تو وہ میدان جنگ سے بھاگ نکلتے اور اسی کو اپنی کامیابی جانتے۔ وہ عام طور پر پہاڑوں اور غاروں میں جا چھپتے اور جب فوج کا کوئی دستہ اُن کا پیچھا کرتے ہوئے ادھر آنکلتا وہ سب طرف سے نکل کر اچانک حملہ کر دیتے۔

ہر چند اورنگ زیب نہایت جنگجو، بہادر اور باتدبیر سپہ سالار تھا مگر شاہجہاں اور دارا کا ناروا سلوک اس کی حوصلہ افزائی کے بجائے دل شکنی کرتا رہتا تھا۔ مقصود یہی تھا کہ عالمگیر کسی طرح نافرمانی اور بغاوت کرے مگر عالمگیر میں بھی بلا کا صبر و تحمّل اور بردباری تھی۔ وہ ہر تلخ سے تلخ شے کو خالص شہد اور عسلِ مصفیٰ سمجھ کر پیتا رہا۔ مثلاً گولکنڈہ کے واقعہ کو دیکھیں۔ قطب الملک والیٔ گولکنڈہ مغلیہ سلطنت کا باجگزار تھا اس نے بغاوت وسرکشی کی تو شاہجہاں نے اس کی سرکوبی کے لئے اورنگ زیب کو حکم دیا۔ اورنگ زیب نے فوراً حکم کی تعمیل

کی اور فتوحات کرتا ہوا گولکنڈہ تک پہنچ گیا اور اس کا محاصرہ کرلیا۔ جب قطب الملک تنگ آگیا تو اس نے مجبور ہوکر اپنی بوڑھی والدہ کو عالمگیر کے پاس بھیج کر صلح کی درخواست کی۔ مگر عین اسوقت جب صلح کی شرطیں طے ہورہی تھیں اورنگ زیب عالمگیر کے نام شاہجہاں کا فرمان آگیا کہ محاصرہ کو اٹھا کر اور قطب الملک کا پورا ملک اُس کے حوالے کرکے فوراً اپنے صوبے کو واپس چلے جاؤ۔

قصہ یوں ہوا کہ قطب الملک نے اپنا ایک سفیر دارا کے پاس بھیج کر اسے اور اس کے گروہ کو اپنے حق میں ہموار کرلیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دارا نے شاہجہاں سے کہہ کر محاصرہ ختم کرنے کا حکم بھجوا دیا۔ اب ایسے حالات میں اگر اورنگ زیب عالمگیر کی جگہ خود شاہجہاں کا لاڈلا فرزند دارا شکوہ ہی کیوں نہ ہوتا وہ بھی یقیناً مخالفت کرتا اور شاہجہاں سے بغاوت کرنے پر آمادہ ہوجاتا۔ مگر یہ صرف عالمگیر ہی کا دل گردہ تھا کہ اس نے ایک سعادت مند بیٹے کی طرح باپ کے حکم کی تعمیل کی۔ باوجود اس کے کہ بھائی اور باپ کی شاطرانہ چالیں اسے ناکام بنانے میں برابر لگی ہوئی تھیں اور صاف نظر آرہا تھا کہ ان دونوں کو عالمگیر کا وجود گوارہ نہیں لیکن عالمگیر نے پھر بھی کوئی مخالفت نہیں کی، اور نہ اپنے فرض ہی سے غفلت کی۔

والیٔ بیجاپور عادل شاہ کے واقعہ کو لے لیں۔ یہ بھی مغل سلطنت کا باج گزار تھا اور شاہجہاں سے اطاعت کرنے کا اقرار کرکے صلح

کر چکا تھا لیکن حال یہ تھا کہ جب قطب الملک والئی گولکنڈہ نے سر اٹھایا تو اس نے مغل سلطنت کے خلاف قطب الملک کو بڑی امداد بہم پہنچائی۔ اس پر ستم یہ کہ اس نے اپنے درباری ملازم ساہو جی بھوسلہ کے بیٹے سیواجی کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ مغل سلطنت کی سرحدوں پر حملہ کر کے ان کی توجہ کو بیجاپور سے ہٹا دے۔ اور خود ساہو جی کو اس کام پر تیار کر لیا کہ وہ کرناٹک کے ایک حصے پر قبضہ کر لے۔

۲۶ محرم ۱۰۶۷ھ کو عادل شاہ فوت ہو گیا۔ وہ چونکہ بے اولاد تھا اس لئے بیجاپور کے امراء نے شاہجہاں سے اجازت لئے بغیر عادل شاہ کے متبنّٰی بیٹے کو علی عادل شاہ ثانی کے نام سے تخت پر بٹھا دیا۔ غرض یہ احوال تھے کہ جنہیں سامنے رکھتے ہوئے شاہجہاں نے اورنگ زیب کو بیجاپور پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ ہر چند گولکنڈہ کی مہم کے تلخ نتیجے سے عالمگیر متاثر تھا تاہم اس نے ایک سعادتمند بیٹے کی طرح فوراً حملہ کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا، کہ وہ بیجاپور کی فوجوں کو پسپا کرتا ہوا ملک کے بہت بڑے حصے پر قابض ہو گیا۔ اب وہ بیجاپور کی طرف بڑھنے والا ہی تھا کہ شاہجہاں کا پھر یہ فرمان اس کے پاس آ گیا جس میں لکھا تھا کہ جنگ فوراً ختم کر دو۔ اس کے ساتھ فوج کے دوسرے افسروں کے نام فرداً فرداً فرمان پہنچا کہ دکن سے جلد واپس آ جاؤ۔ چنانچہ مہابت خاں اور اس کی فوج اور دیگر تمام سپہ سالار اور فوجیں عالمگیر سے رسمی اجازت لئے بغیر دہلی چلی گئیں۔

یہ سب کچھ کارروائیاں صرف عالمگیر کو ذلیل کرنے کے لئے داراشکوہ کی طرف سے ہو رہی تھیں، اور شاہجہاں کی محبت کا ناجائز فائدہ اٹھایا جا رہا تھا۔ اور صاف نظر آ رہا تھا کہ داراشکوہ مختارِ کل ہے اور شاہجہاں اس وقت مردہ بدست زندہ تھا۔ جو دارا چاہتا تھا وہی ہوتا تھا۔ وہ عالمگیر کے خون کا پیاسا تھا مگر اس پر کسی طرح اس کا بس نہ چلتا تھا۔ حالانکہ دارا کے مقابلے میں عالمگیر محدود وسائل کا مالک تھا نیز اس وقت چاروں طرف سے وہ دشمنوں میں گھرا ہوا تھا۔

۷، ذی الحجہ ۱۰۶۷ھ بمطابق ۶، دسمبر ۱۶۵۷ء میں شاہجہاں اس قدر بیمار پڑا کہ بچنے کی امید نہ رہی۔ اس پر ستم یہ کہ دارا نے اس موقع پر جو کارروائیاں کیں ان سے لوگوں میں اس بات کے پھیلنے کے اسباب پیدا ہو گئے کہ شاہجہاں کا انتقال ہو گیا۔ تمام ملک میں ایک اضطراب اور بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔

ایسے نازک موقع پر شاہجہاں کے دیگر بیٹوں کا جو مختلف صوبوں پر متعین تھے یہ عین فرض منصبی تھا کہ وہ اس واقعہ کی تحقیق کریں۔ مگر دشواری یہ تھی، کہ داراشکوہ نے قدم قدم پر پہرے بٹھا رکھے تھے۔ اس کے علاوہ دارا نے بے حد شرمناک حرکت یہ کی کہ شاہجہاں کے خط کی مشق کر کے اس کے دستخط خود کر لیتا تھا اور اس کے نام سے وہی سب کو فرمان بھیجتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے حالات میں اس کے بھائیوں کے لئے واقعات کی تحقیق کرنا کتنا مشکل تھا۔ تاہم جب مراد کو اس کے جاسوسوں کی انتہائی کوشش کے بعد پتہ چلا

کہ مرگ شاہجہاں کی خبر غلط ہے۔ تو اس نے دارا کے نام ایک طنزیہ خط ارسال کیا جس میں لکھا تھا کہ:

"تم اچھے سعادت مند بیٹے ہو کہ باپ کو قید میں ڈال کر جس کے صدقے میں تمہیں سلطنت کے کاموں میں دخیل ہونے کا موقع ملا ہے اپنے عزیز ترین بھائیوں کے خون کے پیاسے بن گئے ہو۔"

پس اس کے بعد معاملے کی نوعیت بالکل بدل گئی۔ اور اس بات کے قطعی واضح ہو جانے پر کہ داراشکوہ، سلطنت کا بلا شرکت غیرے مالک بن جانے کا خواب دیکھ رہا ہے اور بھائیوں کے قتل کے درپے ہے۔ حفاظت خود اختیاری اور شاہجہاں کی رہائی کے لئے مراد، شجاع اور عالمگیر تینوں بھائی دارا کے خلاف متحد ہو گئے۔

دارا نے بھائیوں کو اپنے راستے سے ہٹانے اور سلطنت کا تنہا مالک بن جانے کے لئے دو فوجیں تیار کیں۔ ایک کو راجا جے سنگھ کی سرکردگی میں شجاع کے مقابلے کے لئے بنارس روانہ کیا اور دوسری فوج کو مہاراجا جسونت سنگھ کی قیادت میں مراد بخش اور عالمگیر کے مقابلے پر بھیج دیا۔ شاہزادہ مراد جو عالمگیر کے ساتھ تھا اس لڑائی کی کیفیت یوں تحریر کرتا ہے،

"روز پنجشنبہ، یکم ماہ رجب المرجب ۱۰۶۸ھ کو دیپالپور میں برادر والا قدر (عالمگیر) سے ہماری ملاقات ہوئی۔ جسونت سنگھ سادات، راجپوت، افغانوں اور مغلوں کی ۳۴ ہزار جنگجو سپاہ کو لئے ہوئے نہایت غرور اور تمکنت کے ساتھ "اجین"

کے قریب پہنچا۔ جمعہ کے روز ہم نے اپنی فوجوں کو آراستہ کیا اور خداوند عالم کی عنایت۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی توجہات مقدسہ پر تکیہ کر کے میں نے فوج کے دست راست اور بھائی اورنگ زیب نے فوج کے دستِ چپ کی کمان کرتے ہوئے دشمن لئیم کی مدافعت میں جد وجہد شروع کر دی۔ توپ خانہ اور آتشبازی وغیرہ کی کارگزاریوں کے بعد بندگان جاں سپار نے گھوڑے ڈال دیئے اور ان کے پیچھے پیچھے یہ مخلص بھی میدانِ جنگ میں کود کر سرگرم قتال وجدال ہو گیا۔ طرفین سے دادِ شجاعت دی گئی۔ اگرچہ فتح وظفر ہماری فوجوں کو نصیب ہوئی۔ راجہ جسونت سنگھ اور قاسم خاں بھاگ نکلے۔ مکند سنگھ ہاڈا۔ افتخار خاں۔ دیالداس، رتن راٹھور اور ارجن گوڑ وغیرہ ہلاک ہو گئے۔ مختصراً یہ کہ پانچ چھ ہزار آدمی دونوں طرف سے قتل ہوئے اور بہت زیادہ خزانہ۔ ہاتھی گھوڑے، خیمہ اور توپ خانہ وغیرہ ہمارے ہاتھ آیا۔"

شاہجہاں کا خط مہابت خاں صوبہ دار کابل کے نام

عقیدت کیش مہابت خاں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ زمانے کے ہاتھوں اس مغل سلطنت کو کتنا بڑا نقصان پہنچا ہے۔ اب فرزند مظلوم شکست کھا کر لاہور چلا گیا ہے اس آڑے وقت میں تم ہی ایک مخلص اور عقیدت مند ہو جو دنیا کے معمولی فائدوں کو خاطر میں لائے بغیر ننگ و ناموس کو سامنے رکھو گے۔

ہم تمہیں اپنا درد دل تحریر کر رہے ہیں اور تم سے مناسب تدارک کی امید رکھتے ہیں۔ داراشکوہ عنقریب لاہور پہنچ جائے گا۔ لاہور میں خزانے کی کمی نہیں اور آدمی اور گھوڑے کابل میں بکثرت ہیں۔ اس موقع پر مہابت خاں جیسا بہادر جس کی ہیبت سے زمانہ کانپتا ہے اگر شاہجہاں کی طرح گوشہ نشین رہے تو ہزار تعجب ہے:

مناسب یہ ہے کہ مہابت خاں ایسا بہادر آراستہ لشکر لے کر عزیمت کرے اور جلد لاہور پہنچ کر داراشکوہ بابا کی رفاقت اور مدد کرے۔ اور ان دونوں (مراد اور اورنگ زیب) نابرخورداروں کو جزائے اعمال پر پہنچانے کی کوشش کرے اور صاحب قران ثانی (یعنی شاہجہاں) کو قید سے رہائی دلائے۔

اورنگ زیب اپنے خطوط کے آئینہ میں

شاہجہاں کے نام
جنگِ برادران کے بعد عالمگیر کا ایک خط

اورنگ زیب عالمگیر نے حسبِ دستور سابق فرزندانہ، مریدانہ اور نیاز مندانہ آداب کے ساتھ پدرِ گرامی قدر اور بادشاہ وقت کی خدمت میں ایک طویل عرضداشت پیش کرنے کے بعد لکھا:

"اس دوران میں سلطنت اور مملکت کے جملہ ملکی اور مالی امور کی زمام اختیار حضرت والا کے قبضۂ قدرت سے خارج ہو کر شاہزادہ کلاں (دارا شکوہ) کے قبضے میں پہنچ گئی۔ جس نے امور سلطنت کے بست وکشاد میں وہ اقتدار حاصل کر لیا جو احاطۂ تحریر و تقریر سے باہر ہے۔ یہ قدرت و تسلّط پاتے ہی اپنے بھائیوں کے

استیصال کو اپنا اولین مقصود گردانا۔ جس میں اس کی جدوجہد روز بروز بڑھتی رہی۔ چنانچہ حضرت والا کے فرزند رشید شجاع کے سر پر اپنے نوعمر لڑکے سلیمان شکوہ کو مسلط کیا۔ شجاع کی ۲۲ سال کی خدمات کی کوئی وقعت نہیں کی اور اسے حد سے زیادہ ذلیل و رسوا کیا۔ اپنی خواہشات نفسانی صرف خواہشات نفسانی کی بنا پر اس نیاز مند کی توہین و تذلیل کی ہمیشہ کوشش کرتا رہا۔ منافع اور آمدنی کے راستے اس نیاز مند کیلئے روکتا اور بند کرتا رہا۔ اور طرح طرح کے نقصان پہنچاتا رہا۔ اور ہمیشہ وہ کام کرتا رہا جو دین اور ملت کے مخالف، بندگان خدا، اور انسانی آبادی کے لئے تباہی اور بربادی کا باعث تھے۔"

☆

بیجاپور کی مہم کا حوالہ دیتے ہوئے پھر لکھتا ہے

" اور دارا کی اس ناعاقبت اندیشانہ حرکت کے بعد اگر خدا کا فضل و کرم شامل حال نہ ہوتا تو دکن کے انہی فرمانرواؤں کے ہاتھوں تمام سلطنت برباد ہو چکی ہوتی۔ یہ سب حرکت اس نے صرف اپنی ذاتی غرض کے لئے کی۔ جس میں وہ اس قدر اندھا ہو گیا کہ خود سلطنت کی تباہی و بربادی کا خیال بھی نہ کر سکا۔ پھر اپنی اسی مخالفت اور خصومت پر جس کی شہرت ایران اور توران تک ہو چکی ہے، قناعت نہیں کی۔ بلکہ مجھ

ایسے وفادار سے جس نے ساری عمر حضور والا کی اطاعت میں صرف کی اور کبھی کسی معمولی حکم کے خلاف نہیں چلا۔ اور حکم عدولی کو ہمیشہ گناہ عظیم تصور کرتا رہا۔ صوبہ برار کو علیحدہ کر کے ایک ایسے شخص کے حوالے کرنا چاہا جو ہمیشہ حکومت کا مخالف رہا۔ اور جس کی غداری طشت از بام ہے۔ پھر خوشامدیں کر کے جسونت سنگھ کو میری سرکوبی کے لئے ایک لشکر جرار کے ساتھ روانہ کیا۔ مقصود یہ تھا کہ جس طرح بھی ممکن ہو وہ مختصر سا علاقہ جو حضور والا نے اس نیاز مند کو مرحمت فرما رکھا ہے اس نیاز مند سے چھین کر نیاز مند کو آوارہ فنا بیکسی و غربت اور سراسیمہ صحراء محن و کرب کر دے۔

علاوہ ازیں خوشامدوں اور غلط چاپلوسی سے حضور والا کے مزاج اقدس پر اتنا اثر جما لیا ہے کہ جو کچھ وہ کہتا ہے حضور والا بلا تحقیق و تفتیش اس بات کو صحیح سمجھتے ہیں اور اس کی رائے پر عمل فرماتے ہیں اور جملہ اختیارات ملکی اس کے حوالے کر دیئے ہیں۔ اس صورت حال کے بعد ہمارے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا کہ خود حاضر خدمت ہو کر اصل واقعات عرض کریں اور بارگاہ سلطانی میں اپنی مظلومیت کا اظہار کر کے عدل و انصاف کے طالب ہوں۔

؎ عدلِ سلطاں گر نہ پرسد حالِ مظلومانِ عشق
گوشہ گیراں راز آسائش طمع می باید برید

جب یہ خیر خواہ مسافت طے کر کے "اجین" کے قریب پہنچا، تو جسونت سنگھ جو شاہزادہ کلاں کے اشارے سے اس خیر خواہ کی ایذا رسانی کے لئے وہاں مامور تھا سنگِ راہ بن گیا۔ اور بلا لحاظ آداب و حقوق نہایت دلیری کے ساتھ حکم کیا کہ "مراجعت نمودہ بمکان خود برود والا خواہد دید آنچہ خواہد دید" نیاز مند کے سنجیدہ پیغامبروں نے اسے متانت اور سنجیدگی کے ساتھ بہت کچھ سمجھایا کہ صرف اعلےٰ حضرت کی زیارت کے لئے جانا مقصود ہے مگر اس کے مغرور ذہن میں ایک بات بھی نہ آئی، اور وہ اپنے لشکر و قوت کے گھمنڈ میں آمادۂ جنگ ہو گیا ایسی صورت میں ہر ذی ہوش کا کام تھا کہ اس راستے کے پتھر کو راستے سے ہٹا کر اسے غرور اور تکبر کا مزہ چکھائے۔

اگر خدمت اقدس میں حاضری کے علاوہ کوئی اور مقصد ہوتا تو ظاہر ہے کہ جب جسونت سنگھ اور اس کا لشکر شکست فاش کھا کر بد حواس بھاگ رہا تھا تو پیچھا کر کے انہیں قتل کر دیا جاتا۔ یا کم از کم قید کر لیا جاتا۔ مگر یہاں تو صرف راستہ صاف کرنا مقصود تھا۔

اب شاہزادہ دارا شکوہ بذاتِ خود دھولپور تشریف لاتے

ہیں۔ آپ نے دریائے چنبل کے تمام گھاٹوں پر توپ خانے اور فوجی دستے مقرر رکھ کے میرے لئے دریا کا عبور کرنا غیر ممکن بنادیا تھا۔ مگر اس غیر ممکن کو نیاز مند نے ممکن بنادیا ہے۔ اور دریائے چنبل سے پار ہو کر حضور والا کی قدم بوسی کا ارادہ کئے ہوئے ہے۔ سُنا جارہا ہے کہ اب بذاتِ خود میدان کارزار گرم کریں گے یہ ان کی بزرگانہ شان کے خلاف ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ مجھ ایسے کار آزمودہ جنگجو کے مقابلے پر ان کا بازی لے جانا قطعاً ناممکن ہے۔ اس لئے بہتری اسی میں ہے کہ اپنی بزرگی کا وہ خود احترام کریں اور اس ارادے کو ترک کریں اور اپنے علاقہ پنجاب میں تشریف لے جائیں۔ اور کچھ دنوں اس نیاز مند کو اعلئے و اقدس (یعنی شاہجہاں) کی خدمت میں باریابی کا موقع دیں۔"

مگر افسوس دارا حکومت کی طلب میں اندھا ہو چکا تھا اور شاہجہاں دارا کی محبت میں۔ اس نے عالمگیر کی ایک نہ مانی اور نہ چلنے دی۔ بالآخر ۷ رمضان المبارک ۱۰۶۸ھ کو دارا نے پورے اہتمام کے ساتھ اپنے لشکروں کو آراستہ کیا اور عالمگیر کے مقابلے کے لئے تیار ہو گیا۔ مگر شام ہونے سے پہلے ہی وہ بدحواس ہو کر بھاگنے پر مجبور ہوا اور سورج ڈھلنے کے بعد آگرے جا پہنچا۔ شاہجہاں کے پاس جاتے ہوئے وہ شرماتا تھا۔ اس لئے چپکے سے راتوں رات یہاں سے بیوی بچوں اور جواہرات کے صندوقچوں کے ساتھ دہلی پہنچ گیا۔

اس کے بعد داراشکوہ پنجاب اور گجرات میں تھوڑا عرصہ ٹھہر کر ایک سال تک عالمگیر کو شکست دینے کی برابر کوششیں کرتا رہا۔ بالآخر شوال ۱۰۶۹ھ میں گرفتار ہو گیا۔ وسط ذی الحجہ میں دہلی لایا گیا۔ ۱۰۶۹ھ ذی الحجہ کے آخری دن اسے قید ہستی سے رہائی مل گئی۔

داراشکوہ کے قتل کے بعد شہزادہ مراد کو جو اورنگ زیب کے ہمراہ تھا۔ تمام ہندوستان کی سلطنت کا لالچ دے کر توڑنے کی کوشش کی گئی۔ چنانچہ شاہجہاں نے اسے لکھا کہ تمام ہندوستان کی بادشاہت تمہیں دے دی گئی ہے۔ تم پر فرض ہے کہ ابھی کسی سے اس کا ذکر نہ کرو۔ بلکہ ایسا کرو کہ تھوڑے دنوں بعد اپنے بھائی اور بھتیجوں (اورنگزیب اور اس کی اولاد) کو اپنے یہاں دعوت کے بہانے بلا کر قتل کر ڈالو۔ تاکہ تمہارا راستہ بالکل صاف ہو جائے۔ پھر اس کے بعد تمام ملک میں اپنے نام کا سکہ اور خطبہ جاری کر کے بڑے اطمینان کے ساتھ حکومت کرو۔

پھر اس کے کچھ عرصہ بعد شجاع کے نام ایک خط ہندی زبان میں لکھا گیا جس میں اسے بادشاہت کا لالچ دے کر اورنگ زیب عالمگیر کے قتل پر ابھارا گیا۔ مگر حسن اتفاق سے وہ خط اورنگ زیب عالمگیر کے ہاتھ لگ گیا۔ ہر چند باپ کے اس رویئے سے اُسے بڑا دکھ ہوا۔ تاہم اس نے باپ کے ادب واحترام کا پورا پورا خیال رکھا۔ اس نے شاہجہاں کے پاس ایک مفصل خط بھیجا، جس کا مضمون یہ تھا۔

" اعلیٰ حضرت دانشمند ہیں۔ زمانہ کی گرمی اور سردی پستی اور بلندی

کے تجربوں میں عمر گرامی کے بیشتر اوقات صرف ہوئے ہیں۔ اسی
بنا پر میرا عقیدہ تھا کہ جو واقعات پیش آچکے ہیں ان کو تقدیری
امور سمجھ کر اور اس امر پر راضی ہو کر کہ قضا و قدر کا فیصلہ یہی
تھا کہ تخت و تاج اور سلطنت اس جانثار کے حوالے ہو۔ اس
مرید کی شکست اور دوسروں کے کام کی رونق اور ترقی کی کوشش
نہ فرمائیں گے۔ چنانچہ جنابِ والا کے ساتھ نیاز مند نے
بڑی حد تک بہتر ہی سلوک کیا اور پوری خواہش تھی کہ مخالفین
کی اس شورش کے ختم ہونے کے بعد حضرتِ والا کی رضا جوئی
اور خدمت گزاری کے لئے جان و دل سے کمر ہمت کس لوں گا۔
ہر چند سنتا رہا کہ غبار فساد کی برانگیختی اور بندگان خدا کے
معاملات کی یہ برہم خوردگی آنحضرت (شاہجہاں) کی تحریک سے
ہے اور فرمان اقدس کے بموجب ہی بھائی صاحبان ہاتھ پیر
مار رہے ہیں اور اپنی جانیں برباد کر رہے ہیں۔ مگر میں نے
کبھی لوگوں کے کہنے پر کان نہیں دھرا اور شاہراہ عقیدت
سے انحراف کا خیال بھی نہیں کیا۔ مگر جب اعلےٰ حضرت کی
بے توجہی کی خبریں پے درپے اور مسلسل پہنچیں جیسا کہ اس
تحریر سے ظاہر ہے جو شاہزادہ شجاع کے نام ہندی میں لکھی
ہے اور جس کی بنا پر اس کے خانماں کا برباد ہونا جناب والا
کو بھی معلوم ہے تو لامحالہ یقین ہو گیا کہ آنحضرت اس

ارادت کیش، عقیدت مند کو نہیں چاہتے اور اس کے باوجود کہ ہاتھ سے معاملہ نکل چکا ہے جنابِ والا اب تک جستجو میں ہیں کہ کوئی دوسرا ہی استقلال حاصل کرے اور اس بندے کی وہ تمام کوششیں جو دینِ متین کی ترویج اور معاملاتِ سلطنت کے انتظام میں خرچ ہو رہی ہیں۔ ضائع اور برباد ہو جائیں۔ نیز یہ کہ جنابِ والا کسی صورت سے بھی اس طرزِ عمل اور فکر سے علیحدہ نہیں ہو سکتے۔ بلکہ اصرار کے ساتھ اسی پر کاربند رہیں گے ان حالات میں مجبور ہو کر محض حزم و احتیاط کے طور پر تاکہ کوئی ایسی خرابی نہ پیدا ہو جائے جس کا تدارک ناممکن ہو۔ افسوس کہ اس آرزو کو عملی جامہ نہیں پہنا سکا جو میرے دل میں تھی۔ میرے قول کی صداقت پر خدا، توانا، شاہد اور گواہ ہے۔ اس ارادت مند کو اطمینانِ خاطر اس وقت حاصل ہوگا جب کہ وہ دو فتنے جو بار بار بے غیرتی کو اپنے سر لے چکے ہیں فرار ہو کر ممالکِ محروسہ سے باہر نہ ہو جائیں یا توفیقِ الٰہی سے گرفتار ہو کر اپنے بھائی کے پہلو میں بیٹھیں۔

سرِ دارث ملک تا بر تن است
تن ملک را فتنہ پیراہن است

جب یہ فتنہ فرو ہو جائے گا پھر اس احتیاط اور پابندی کی ضرورت ہی کیا رہے گی۔

اورنگ زیب کا ایک خط شاہجہاں کے نام

"کیا حضور یہ چاہتے ہیں کہ میں پرانی اور فرسودہ رسموں کا سختی سے پابند رہوں۔ اور جو کوئی ہمارا نوکر چاکر مر جائے اس کی جائیداد ضبط کر لوں۔ اگرچہ شاہان مغلیہ کا یہ دستور برس ہا برس رہا ہے، کہ اپنے کسی امیر یا کسی دولت مند مہاجن کے مرنے کے بعد بلکہ بعض بعض اوقات تو دم نکلنے سے بھی پہلے ہی اس کے تمام مال و اسباب کا تعلیقہ کراتے تھے اور جب تک اس کے نوکر چاکر ایک ایک کر کے تمام چھوٹی بڑی چیزیں نہ بتلا دیں، ان پر سختی کی جاتی اور مار پیٹ کر قید میں بھی ڈال دیا جاتا تھا۔ اور یہ دستور بے شک فائدہ مند بھی ہے لیکن جو بے انصافی اور بے رحمی اس میں ہے اس سے کون انکار کر سکتا ہے۔ اور اگر ہر امیر نیک نام خاں کا سا معاملہ کرے یا کوئی عورت اس بیوہ مہاجنی کی طرح اپنے مال پوشیدہ کر لے تو اس میں وہ حق بجانب ہے کہ نہیں۔

حضور کی ناراضی سے بہت ڈرتا ہوں اور یہ بات برداشت نہیں کر سکتا کہ حضور میرے طور و طریق کے بارے میں کوئی غلط رائے قائم فرمائیں، اور جیسا کہ حضور خیال فرماتے ہیں تخت نشینی سے مجھ میں خود رائے اور غرور پیدا ہو گیا۔ چالیس برس کے

تجربے سے حضور خود ہی خیال فرما سکتے ہیں کہ تاج شاہی کس قدر گراں بار شے ہے اور بادشاہ جب دربار سے اٹھتا ہے تو افکار کا ہجوم اس کے دل کو کتنا غمگین اور دردمند بناتا ہے۔ ہمارے مشہور و معروف جدامجد جلال الدین محمدؐ اکبر نے اسی غرض سے کہ ان کی اولاد عقل و فراست اور تمیز و نرمی کے ساتھ حکومت کرے اپنے عہد سلطنت کی تاریخ میں امیر تیمور گورگان کا ایک ذکر نمونے کے طور پر لکھ کر اپنی اولاد کو اس کی طرف توجہ دلائی ہے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ جب بایزید یلدرم گرفتار ہو کر امیر تیمور کے حضور میں لایا گیا اور امیر بہت غور و فکر کرنے کے بعد اس مغرور قیدی کی طرف دیکھ کر ہنس دیا تو بایزید نے خفا ہو کر امیر سے کہا کہ تمہیں اپنی فتح مندی پر غرور نہ کرنا چاہیئے۔ عزت اور ذلت اللہ کی طرف سے ہے اور ہو سکتا ہے کہ جس طرح تم نے آج فتح پائی ہے کل میری طرح پکڑے جاؤ۔ امیر نے جواب دیا کہ میں دنیا اور اس کی حکومت اور دولت کی بے ثباتی اور ناپائیداری کو خوب سمجھتا ہوں اور خدا نہ کرے کہ میں اپنے کسی مغلوب دشمن کی ہتک کروں، اور میرے ہنسنے کا یہ سبب نہ تھا کہ تمہارا دل دکھاؤں۔ بلکہ مجھے تمہیں دیکھ کر اپنی اور تمہاری بدصورتی کے خیال سے بے ساختہ ہنسی آگئی۔ کیونکہ تم کانے ہو اور میں لنگڑا ہوں اور یہ خیال میرے دل میں گزرا کہ تخت و تاج اور سلطنت ایسی

کیا چیز ہے جسے پاکر بادشاہ اپنی ہستی کو بھول جاتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ ایسے بندوں کو عطا کرتا ہے جو کانے اور لنگڑے ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضور یہ خیال فرماتے ہیں کہ میری مصروفیت ان امور کی بہ نسبت جنہیں میرے نزدیک سلطنت کے نظم و نسق، ملک داری اور اندرونی استحکام کے لئے اہمیت حاصل ہے۔ نئی نئی فتوحات اور ملک گیری کیطرف زیادہ ہونی چاہیئے۔ مجھے اس بات سے ہرگز انکار نہیں کہ ایک بڑے شہنشاہ کا عہد حکومت نئی نئی فتوحات کے سبب متمیز اور ممتاز ہوتا ہے۔ اور اگر میں ایسا نہ کروں تو گویا اپنے نامور بزرگ امیر تیمور گورگان کی نسل کو دھبا لگاؤں گا۔ لیکن یہ بات بہر حال قرین انصاف نہیں کہ مجھے کاہل اور سست ہوکر بیٹھے رہنے کا الزام دیا جائے۔ کیونکہ بنگال اور دکن میں میری فوجوں کی مصروفیت کے بارے میں تو حضور بھی خیال نہیں فرما سکتے کہ وہ بیکار رہے اور میں حضور کو یہ بھی یقین دلاتا ہوں کہ بڑے سے بڑا ملک گیر حکمران بھی ہمیشہ سب سے بڑا بادشاہ نہیں ہوا۔ عام دیکھنے میں آیا ہے کہ کبھی کبھی دنیا کے اکثر حصے بالکل وحشی اور غیر مہذب قوموں نے فتح کر لئے اور نہایت وسیع و عریض سلطنتیں تھوڑی ہی مدت میں بالکل ٹکڑے ٹکڑے ہوگئیں۔ پس حقیقت میں سب سے بڑا بادشاہ وہی ہے جو رعایا پروری اور عدل و انصاف ہی کو اپنی زندگانی کا حاصل سمجھے۔

خط — عالمگیر کا اپنے ایک بیٹے کے نام

فرزند عالی جاہ! ایک معتبر شخص کی زبانی یہ نقل کانوں تک پہنچی ہے

جو رشتہ تحریر میں منسلک کی جاتی ہے تاکہ آپ بھی اس سے سبق حاصل کریں۔

اعلیٰ حضرت (شاہجہاں) نے ایک روز علی مردان خاں اور سعد اللہ خاں کو خصوصیت کے ساتھ خلوت خاص سے نواز کر زبان گوہر فشاں سے فرمایا۔ ملک و مال کا بندوبست فہم و انصاف پر منحصر ہے۔ معاذ اللہ اگر کوئی بادشاہ جو قابلیت کے جوہر سے محروم ہو زینۂ خلافت پر فائز ہو جائے اور ایسے وزراء اور امراء کو جو حسن تدبیر سے عاری ہوں کام پر لگا دے تو نظم و نسق ممالک میں پورا خلل اور نقصان رونما ہو جائیگا۔ اس کا یہ فعل رعایا کی پریشانی، خلق اللہ کی بے سامانی، آمدنی کی کمی اور ملک کی ویرانی کے لئے ایک وثیقہ ہو گا۔ آپ دونوں صاحبان خدا کے لئے فقراء اور صلحاء کی خدمت میں حاضری دیتے ہوئے پانچوں نمازوں کے بعد دعا کرتے رہو کہ ہماری سلطنت کی رونق میں کوئی کمی نہ پیدا ہونے پائے۔ کوئی شخص ہمارے بارے میں زبان پر بری بات نہ لائے اور ہمارے بعد جو بیٹا بھی فرمانروا ہو اسے اچھے کاموں کی توفیق ملے۔ بعض وقت خیال آتا ہے کہ مہین پور خلافت (دارا شکوہ) شان و شوکت اور تجمل و صورت کے اسباب و سامان بہت کچھ رکھتا ہے۔ لیکن وہ نیکوں کا دشمن ہے اور بروں کا دوست واقع ہوا ہے۔

ع بابداں نیک و بد بہ نیکاں است

شہزادہ شجاع میں صرف ایک وصف ہے یعنی سیر چشمی۔ اس کے سوا کوئی اور وصف اس میں نہیں۔ شہزادہ مراد مجہول الکیفیت ہے۔ کھانے پینے کا شوقین ہے، شراب میں ہمیشہ مست رہتا ہے۔

دارا شکوہ اور اس کا مذہب

ڈاکٹر برنیر ایک فرانسیسی معالج تھا، جو ۱۶۵۶ء سے ۱۶۶۸ء تک پورے بارہ برس مغل دربار سے وابستہ رہا۔ وہ سیر و سیاحت کی غرض سے اس وقت یہاں پہنچا کہ جب شاہجہاں کے تخت و تاج کے لئے اس کے چاروں بیٹے دارا شکوہ۔ شجاع۔ اورنگ زیب اور مراد باہم دگر دست و گریباں تھے۔ اس زمانے میں دارا شکوہ جان چھپانے کے لئے گجرات میں مارا مارا پھرتا تھا۔ کہ وہیں کہیں برنیر کی اس سے ملاقات ہوگئی۔ اور وہ دارا کے علاج معالجے کے سلسلے میں کچھ مدت کے لئے اس کے ساتھ ٹھہر گیا۔ برنیر نے اپنی آنکھوں دیکھے حالات کا آغاز چونکہ جنگ و جدل سے کیا جو حکومت و سلطنت کے لئے بھائیوں میں برپا تھا۔ اس لئے ہم

نے یہ مناسب سمجھا کہ اورنگ زیب عالمگیر کی ذات والا صفات پر جتنے ایک الزامات عائد کئے جاتے ہیں ان کی تردید کے لئے برنئیر کے بیانات کو بھی پیش نظر رکھا جائے۔ ہر چند برنئیر نے داراشکوہ کی بڑی طرفداری کی ہے تاہم اس سے وہ بھی یہ اعتراف کئے بغیر نہ رہ سکا، کہ شاہجہاں کے بیٹوں میں صرف اورنگ زیب ہی حکومت وسلطنت کی صلاحیت رکھتا ہے۔

برنئیر داراشکوہ کے مذہب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے دارا گفتگو میں بہت شیریں زباں۔ حاضر جواب، نہایت خوش خلق۔ بیحد فیاض اور دریا دل تھا۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ بڑا ہی خودرائے اور خود پسند تھا۔ اسے یہ گھمنڈ تھا کہ میں اپنی عقل کی رسائی اور خوش تدبیری سے ہر کام کو مکمل کر سکتا ہوں اور ہر بات کا انتظام کرنے پر قدرت رکھتا ہوں، اور کوئی شخص ایسا نہیں جو مجھ کو صلاح ومشورہ دے سکے یا مجھ سے بہتر کوئی کام کر کے دکھا سکے۔ چنانچہ یہی وہ سبب ہے کہ داراشکوہ کے قریب رہنے والے بھی جن پر وہ اعتماد رکھتا اور بھروسہ کرتا تھا اس کے اس ناپسندیدہ طرزِ عمل سے شاکی ہیں۔ اور انھوں نے اُن کارروائیوں سے آخر دم تک اسے بے خبر رکھا جو داراشکوہ کے خلاف اس کے بھائی کر رہے تھے۔

داراشکوہ لوگوں کو ڈرانے دھمکانے میں بھی بہت تیز تھا۔ یہاں تک کہ سلطنت کے بڑے بڑے امیروں کو بُرا بھلا کہہ ڈالتا اور ان کی عزت ہتک کر بیٹھتا تھا۔ اگرچہ اس کا غصہ اور بدمزاجی آن کی آن میں

جاتی رہتی تاہم یہ طرزِ عمل اس کے لئے نہایت نقصان دہ ثابت ہوا۔

اگرچہ داراشکوہ اسلامی روایات اور شعائر کو تسلیم کرتا تھا۔ اور تقریبات میں شریک ہوتا لیکن پھر بھی وہ ایک پیدائشی مسلمان سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔ کیونکہ وہ تخلیئے کے اوقات میں ہندوؤں کے ساتھ ہندو اور عیسائیوں میں مل کر عیسائی تھا۔ پنڈت اور ہندو سادھو ہمیشہ اس کے ساتھ رہتے تھے۔ اور یہ انہی لوگوں کی صحبتوں کا نتیجہ تھا کہ داراشکوہ کے اسلامی عقائد میں ضعف پیدا ہو گیا۔ مگر بعض لوگ یہ کہتے ہیں۔ کہ داراشکوہ کا کوئی مذہب نہ تھا وہ یہ سب دکھاوے کے لئے کرتا تھا۔ اس میں مصلحت یہی تھی کہ وہ عیسائی جو اس کے توپخانے میں نوکر تھے، اور ان کی تعداد بھی کافی تھی۔ اسے عیسائی سمجھ کر پسند کریں اور اس سے محبت کرنے لگیں۔ اور اپنی ہندویت ظاہر کرنے سے اس کا مقصد یہ تھا کہ باج گذار ہندو راجاؤں کا دل اپنی مٹھی میں کر لے تاکہ ضرورت کے وقت ان سے امداد اور تعاون حاصل کر سکے۔ لیکن عیسائیوں اور ہندوؤں کے مذاہب اور عقائد کی طرف رغبت کرنے کے یہ جھوٹے حیلے بہانے کسی طرح بھی اس کے ارادوں اور منصوبوں کے لئے کارآمد ثابت نہ ہو سکے۔ یہی سبب ہے کہ اورنگ زیب نے داراشکوہ کا قتل جائز ٹھہرایا کہ وہ کافر اور لامذہب یعنی بے دین ہو گیا ہے۔

شاہجہاں کی زندگی کے آخری دنوں میں داراشکوہ کو سلطنت کے تمام کاروبار اور انتظام میں پورا دخل حاصل ہو چکا تھا۔ جب شاہجہاں

کی اولاد نے دیکھا کہ باپ لب مرگ ہے اور بیماری سے اٹھنے کی اب کوئی امید نہیں تو چاروں بیٹے اپنی اپنی جگہ بادشاہت کے حصول کی جدوجہد کرنے لگے۔

ظاہر ہے کہ باپ کے جیتے جی بادشاہت کے حصول کی جدوجہد جنگ وجدل سے خالی نہیں ہوسکتی تھی۔ چنانچہ برنیئر اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ شاہجہاں اس وقت ایک عجیب ناامیدی اور غم و یاس میں گرفتار تھا۔ ایک طرف تو یہ دیکھتا تھا کہ اب مراد بخش اور عالمگیر یہ دونوں کسی طرح سلطنت میں داخل ہوئے بغیر نہ رہیں گے۔ دوسری طرف داراشکوہ کو لڑائی کی بڑی بڑی تیاریاں کرتے دیکھ کر اسے سخت اضطراب ہوتا تھا۔ کیونکہ وہ خوب جانتا تھا کہ جن آفتوں کو وہ طرح طرح کی تدبیروں سے ٹالنا چاہتا تھا اب اس خاندان پر آنیوالی ہیں۔ لیکن داراشکوہ کی خواہشوں کو روک بھی نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ اوّل تو بیماری کی سختیوں ہی سے چھٹکارا نہیں ہوا تھا۔ اس کے علاوہ داراشکوہ کی منہ زوریوں سے مجبور ہوکر فوج اور ملک کے کام سے ہاتھ اٹھا بیٹھا تھا اور امراء اور وزراء سے کہہ چکا تھا کہ اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کریں۔ غرض کہ ان دنوں اس کی حالت یہ تھی کہ داراشکوہ تو بادشاہ اور حاکم تھا اور وہ نوکر اور محکوم۔

اورنگ زیب کا سلوک

نظر بندی کے دنوں میں اورنگ زیب کا شاہجہاں سے کیا سلوک تھا۔ ڈاکٹر

برنیئر اس کے بارے میں یوں لکھتا ہے :

اگرچہ اورنگ زیب نے شاہجہاں کو آگرے کے قلعے میں بڑی احتیاط سے قید کیا ہوا تھا لیکن اس سے نہایت ادب اور ملائمت کا سلوک کیا جاتا تھا۔ اُسے ان شاہی محلوں میں بھی رہنے کی اجازت دے دی گئی تھی جن میں وہ پہلے رہا کرتا تھا۔ اور اس کی مشہور بیٹی بیگم صاحب سے بھی ملنے کی اجازت تھی اور محل کی متعلقہ عورتیں مثلاً باورچی خانے کا عملہ اور گانے اور ناچنے والیاں وغیرہ عورتیں سب موجود رہتی تھیں اور اس کے علاوہ اس کی کسی بات کو ردّ نہیں کیا جاتا تھا، جو طلب کیا جاتا فوراً پیش کیا جاتا۔ جب یہ بڈھا شاہجہاں رقص و سرود کی محفلوں کو چھوڑ کر عابد و زاہد بن گیا تو قرآن پاک کے قاری اور مولوی صاحبان اس کے پاس جاکر قرآن سناتے اور اگر کبھی کھیل تماشے کو جی چاہتا تو خاصے کے گھوڑے باز جرے وغیرہ شکاری جانوروں کے منگا لینے ہرنوں اور مینڈھوں کی لڑائی کا تماشہ دیکھنے کی بھی اجازت تھی۔

غرض اورنگ زیب کا سلوک شاہجہاں سے نہایت مؤدبانہ، ہمدردانہ رہا۔ اس سے جہاں تک ہو سکتا تھا اپنے بوڑھے باپ کی ہر طرح سے دلدہی اور خاطرداری کرتا تھا۔ اکثر اوقات نہایت اعلیٰ اعلیٰ تحفے تحائف بھیجتا رہتا۔ اور سلطنت کے اکثر معاملات میں شاہجہاں کو ایک پیر و مرشد کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے اس سے رائے لیتا اور مشورے حاصل کرتا اور اورنگ زیب کے ان خطوں سے جو وہ اکثر اپنے باپ کے نام لکھتا رہتا کمال اطاعت

اور فرمانبرداری ظاہر ہوتی تھی۔ پس اس طرح شاہجہاں کا غصہ ٹھنڈا پڑ پڑ گیا۔ اور اورنگ زیب سے دل صاف ہوگیا۔ حتیٰ کہ وہ بھی اپنے بیٹے اورنگ زیب کو نہایت اخلاص اور دلسوزی کے ساتھ سلطنت کے بارے میں رائے اور مشورے دینے لگا۔ اس کے علاوہ داراشکوہ کی بیٹی کو بھی اس کے پاس بھیج دیا۔ اور وہ بیش بہا ہیرے جواہرات جن کے دینے سے پہلے انکار کر دیا تھا اور صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ اگر تم نے پھر مانگا تو انہیں کوٹ کر چورا کر ڈالوں گا۔ مگر تمہیں نہیں دوں گا۔ اپنی خوشی سے اپنے آپ اورنگ زیب کے پاس بھجوا دیئے اور صرف یہی نہیں بلکہ اپنے باغی بیٹے یعنی اورنگ زیب کی سب غلطیاں معاف کر کے اس کے حق میں دعائے خیر بھی کی۔

شاہجہاں کے نام خط

بعد ادائے مراسم عقیدت عرض ہے کہ حضور کے دست مبارک سے لکھا ہوا فرمان اس مریدہ کے عریضہ کے جواب میں وصول ہوا جس کا مطالعہ باعث بصیرت اور وجہ سرور تھا۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے حضور کی سلامتی اور صحت وعافیت کی توقع ہے۔ قضا وقدر کے تابع فرمان یہ مجبور بندہ مشیت ایزدی کے مطابق بڑے خطرناک بھنور میں جا پڑا تھا۔ اور بلحاظ ظاہر وباطن بڑے بڑے صدمے اسے برداشت کرنے پڑے، اب وہ اپنی خجالت وشرمندگی کے بارے میں کیا عرض کرے۔ کیونکہ اعلیٰ حضرت پر سب کچھ روشن ہے۔ یہ عاجز تو ہمیشہ درگاہ ایزدی میں دست بدعا رہتا ہے کہ حضور والا کی خوشنودی

اسے حاصل ہو جائے اور اسے "تلافیٔ مافات اور خطاؤں پر عذر خواہی کا موقع مل جائے تاکہ وہ قبلہ و کعبہ کی خوشنودی کے مطابق خدمت انجام دے۔ مجھے امید ہے کہ آپ اپنی دعاؤں میں مجھے یاد رکھیں گے۔ بعض معاملات پر عملدر آمد جیسا کہ اس سے پہلے لکھا گیا ہے، اضطراراً ہے۔ مجھے اس سلسلے میں بھی ہزار بار شرمندگی ہے۔ خواجہ سرا خط نویس کی جس وقت بھی آپ کو ضرورت ہو حکم فرمائیں، فوراً خدمت میں حاضر کر دیا جائے گا۔

شاہجہاں کے نام

بعد ادائے مراسم عقیدت و عبودیت عرض خدمت ہے کہ حضور کے خط خاص سے لکھا ہوا صحیفہ بڑی مدت کے بعد صادر ہوا۔ جس کا مطالعہ میرے لئے سعادت کا باعث ہے۔ جو حال آپ نے لکھا تھا واضح ہو گیا۔

خطوط پر پابندی اور نگرانی کے بارے میں آپ نے دریافت فرمایا ہے، یہ بات حضور پر ڈھکی چھپی نہ رہے، کہ ابتدا ہی میں اور ان حالات کے رونما ہونے کے بعد ہی سے جو تقدیر الٰہی کے تحت پیش آئے۔ میرا عقیدہ یہ رہا کہ حضور "عقلِ کل" ہیں۔ اور حضور کی عمر گرامی کے بیشتر اوقات زمانہ کے پست و بلند اور دنیا کے تجربات میں گزرے ہیں۔ آپ خود ان امور کے قضا و قدر کا نتیجہ جان کر اس ارادت مند کے

معاملات کو بگاڑنے اور دوسروں کے معاملات کو رونق دینے کی کوشش نہ فرمائیں گے۔ جبکہ ارادہ الٰہی ان کے شامل حال ہیں اسی یقین پر میں نے بہتر سے بہتر سلوک کو قائم رکھا تھا اور یہ خواہش تھی کہ شورش کے رفع ہوجانے کے بعد حضور والا کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔ اور اس طرح دین و دنیا کی سعادت مجھے حاصل ہوجائے گی۔

اس دوران میں یہ بات بار بار سننے میں آئی کہ اس فتنہ و فساد کے اٹھنے اور مخلوق کے معاملات کے درہم برہم ہونے میں حضور والا کی تحریک کارفرما رہی ہے اور یہ بھائی آپ ہی کی ہدایت پر ہاتھ پیر مار رہے ہیں اور جان لڑا رہے ہیں مگر میں نے ان لوگوں کی باتوں پر کان نہیں دھرا اور حضور والا کی عقیدت سے انحراف نہیں کیا۔ لیکن افسوس آنحضرت کی بے توجہی کی اطلاعات برابر پہنچتی رہیں۔ چنانچہ یہ بات شجاع کے نام ہندی میں لکھے ہوئے قلمی خط سے بخوبی واضح ہے۔ اب مجھے یقین ہوگیا ہے کہ آنحضرت اس مرید کو بالکل پسند نہیں فرماتے۔ اور جو کچھ ہاتھ سے نکل چکا ہے اس کی تلاش میں لگے ہوئے ہیں کہ دوبارہ ہاتھ آجائے اور اس عاجز کی تمام کوششوں پر پانی پھر جائے۔ حالانکہ یہ عاجز، غلام احکام دین کے اجراء اور مہمات مملکت کے انتظام میں لگا ہوا ہے۔

اب کہ آپ کسی طرح بھی اپنے خیالات کو نہیں چھوڑنا چاہتے اور اپنی اس روش پر برابر اصرار کر رہے ہیں۔ مجھے مجبوراً احتیاطی تدابیر اختیار کرنی پڑیں۔ اور فتنہ و فساد کے تدارک کے لئے مجھے وہ کچھ کرنا پڑا جس کے لئے خدا گواہ ہے کہ میرا دل آمادہ نہیں تھا مجھے تو اب اس وقت اطمینان ہوگا کہ جب وہ فتنہ پرداز جو دومرتبہ بے غیرتی کے ساتھ میرے مقابلے سے بھاگ نکلے۔ وہ ممالک محروسہ سے نکل جائیں یا اللہ پاک کی توفیق و مدد سے گرفتار ہو کر اپنے تیسرے بھائی کے ساتھ بٹھا دیئے جائیں۔

ے سر وارث ملک تا بر تن است
تن ملک را فتنہ پیراہن است

انشاء اللہ تعالے جب مدعیان ملک کا معاملہ ان دو صورتوں میں سے کسی ایک طرح طے پا جائے گا تو پھر بلا وجہ ان احتیاطی تدابیر کو باقی نہیں رکھا جائے گا۔

آپ نے آب دار خانے کے بارے میں لکھا تھا اس صورت میں جبکہ حضور ہمیشہ محل میں رہتے ہیں۔ غسل خانے میں آب خاصہ کی آخر کیا ضرورت ہے؟ اور یہ لباس خانہ پر جو مہر لگائی گئی تھی وہ صرف متعلقہ داروغہ کے فوت ہو جانے سے تھی۔ دوسرے داروغہ کے مقرر ہوتے ہی پوشاک مبارک بدستور بلا زحمت پہنچتی رہے گی۔

شاہجہاں کے نام

بعد ادائے وظائفِ عقیدت عرض ہے کہ اس مرید باصفا کے عریضے کے جواب میں منشورِ عطوفت بڑی نیک ساعت میں صادر ہوا۔ خطاؤں اور غلطیوں کی معافی کی خوشخبری سے بڑی مسرت اور خوشی حاصل ہوئی۔ اب میں آپکے الطافِ کریمانہ کا امیدوار ہوں۔ اللہ کا شکر ہے کہ اعلیٰ حضرت نے انصاف اور قدردانی کی رو سے عفو کو انتقام پر ترجیح دی ہے۔ اور مجھ سراپا گناہ اور روسیاہ کو غم و فکر اور اندوہ ملال کے گرداب سے بچالیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی شانِ کریمی سے امید ہے کہ اس کے بعد اس مرید سے ایسی کوئی بات نہ ہونے پائے گی۔ وہ عالم غیب جسے جھوٹ پر گواہ بنانا اہل اسلام کے نزدیک کفر اور تمام مذاہب کی نظر میں قابل مذمت خیال کیا جاتا ہے۔ بخوبی جانتا ہے کہ یہ مرید کبھی مرضی والا تبار کی مخالفت کا مرتکب نہیں ہوا اور نہ ہے۔

جیسا کہ اہل نفاق آپ کو یقین دلاتے ہیں وہ بالکل غلط ہے یہ بندہ تو خود کو حضور کا نائب سمجھتے ہوئے اس عظیم ذمہ داری کو سرانجام دے رہا ہے۔ لیکن چونکہ نیابت کے اظہار کی صورت میں ملک و ملت کے نظم و نسق اور عوام کی تسلی کا امکان نہیں تھا اس لئے ملک و ملت کے حالات کے تقاضے سے مجبور ہو کر چند روز

کے لئے یہ طرزِ عمل اختیار کرنا پڑا۔ جسے دل قطعاً پسند نہیں کرتا۔
خدا جانتا ہے کہ اس سلسلے میں مجھے کتنی شرمندگی ہے۔

انشاء اللہ تعالیٰ جیسے ہی سلطنت میں مکمل امن و امان قائم ہوا فتنہ و فساد فرو ہوا حضور والا کی پسند اور مرضی مبارک کے مطابق تمام معاملات تشکیل پا جائیں گے۔

یہ مرید جس نے اپنی زندگی کا مقصد صرف حق کی رضا جوئی اور حسن خدمت کو قرار دیا ہے۔ آخر وہ اس دنیائے فانی کی خرافات کے لئے کس طرح اس بات پر راضی ہو سکتا ہے کہ حضور والا کے اوقاتِ مبارک جن کی خوشی پر جان و مال اور اہل و عیال سب قربان ہیں، اطمینان سے نہ گزریں۔ اور محل کے خدام آپ کی خدمت گزاری کی سعادت سے محروم رہیں۔

اس دوران میں چونکہ شجاع فاسد ارادہ لے کر الہ آباد پہنچ چکا ہے اور وہاں شورش برپا کرنے میں مصروف ہے۔ یہ مرید بھی جب ابھی ابھی بڑے شہزادے کی طرف سے کچھ فراغت نصیب ہوئی اللہ تعالےٰ کی امداد اور اس کی تائید کے بھروسے پر اسی ماہ کی ۱۷ تاریخ کو الہ آباد کی طرف روانہ ہو رہا ہے۔ اللہ اور اللہ کے رسول کی اور حضور والا کی باطنی توجہ سے امید ہے کہ بہت جلد اس قضیے سے فارغ ہو جائے گا۔ اس کے بعد وہ قطعاً کسی بھی معاملے میں آپ کی مرضی مبارک

کے خلاف عمل نہیں کرے گا۔

حضرت والا پر یہ بات پورے طور پر واضح ہے کہ اللہ تعالٰی ہمیشہ اپنی امانتیں ایسے ہی شخص کے سپرد فرماتا ہے جو رعیت کی نگہداشت کی ذمہ داریاں اٹھا سکے۔ عقلا جانتے ہیں کہ بھیڑیا پاسبانی کا اہل نہیں ہوتا۔ اسی طرح کوئی کم حوصلے کا شخص حکومت ایسے امر خطیر کی ذمہ داریوں کو سرانجام نہیں دے سکتا۔ کیونکہ حکمرانی سے پاسبانی خلق مراد ہے۔ نفس پرستی اور شہوت رانی نہیں بہرکیف اللہ تعالٰی اس مرید کو حضور والا کے بارے میں خجالت اور شرمندگی سے نجات دے۔

حضور نے جو اس مرید کی خطاؤں اور لغزشوں کو معاف کر دیا ہے اور شہزادہ داراشکوہ کے جواہرات عنایت فرمائے ہیں اس پر وہ تہ دل سے تسلیمات بجالاتا ہے۔ اور اس فضل و عنایت پر بے پایاں اظہار تشکر و امتنان کرتا ہے۔

(ماخوذ منتخب اللباب)

شاہجہاں نے اکتیس ۳۱ برس نہایت شان و شوکت کے ساتھ حکومت کی ۱۰۶۷ھ میں وہ نظر بند ہوا۔ تقریباً آٹھ سال تنہائی میں گزارے۔ ۱۰۷۶ھ میں پیغام اجل آگیا۔

عالمگیر کو جب دنیا سے باپ کے اٹھ جانے کی اطلاع ملی تو سخت ملول ہوا۔ پدر گرامی کی قبر پر جاکر بہت رویا۔ آنسو بہائے اور فاتحہ پڑھی۔

قتلِ شجاع

شہزادہ شجاع بتیس ۳۲ سال سے بنگالہ کی صوبہ داری پر چلا آ رہا تھا عیش و عشرت کی جو زندگی اسے میسّر تھی اس نے اسے نہایت کاہل اور سست بنا دیا تھا۔ چونکہ داراشکوہ سے اسے بھی رقابت تھی اس لئے وہ بھی عالمگیر کا ساتھی بن گیا۔ یعنی عالمگیر، مراد اور شجاع کے درمیان جو ہم آہنگی، یگانگت تھی یہ اتحادِ ثلاثہ صرف داراشکوہ کے استیصال کے لئے اس کے خلاف قائم ہوا تھا۔

شجاع ایک مدت سے اس بات کی آرزو رکھتا تھا کہ صوبہ بہار، یا کم سے کم پٹنہ اسے دیدیا جائے۔ مگر پٹنہ سے ملحق صوبے چونکہ دارا کے تھے اور وہ پسند نہ کرتا تھا کہ اس کے صوبے کی سرحدیں اس کے کسی بھائی کے صوبوں کی سرحدوں سے ملی ہوئی ہوں۔ اس لئے شجاع کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔

پھر جب شاہجہاں کے انتقال کی خبر پھیلی تو شجاع نے بھی مراد کی طرح اپنے استقلال کا اعلان کر دیا اور سلطنت کے تخت پر جلوس کیا نیز اپنے نام کا خطبہ و سکہ جاری کرایا اور اپنے علاقے کی حدوں کو بنارس تک وسیع کر لیا۔

داراشکوہ نے بھائیوں کو راستے سے ہٹانے کے لئے سب سے پہلے یہی کام کیا کہ اپنے بیٹے سلیمان شکوہ اور راجا جے سنگھ کو شجاع کے مقابلے کے لئے بنارس بھیج دیا۔ شجاع نے پہلے ہی حملے میں شکست کھائی اور میدانِ

جنگ سے فرار ہو کر مونگیر جا پہنچا۔ ممکن ہے اس مرحلے پر دارا شکوہ کامیاب ہو جاتا مگر اس نے جو عالمگیر کے مقابلے میں جسونت سنگھ کو بھیجا تھا وہ ناکام رہا۔ اس لیئے دارا نے اپنی امداد کے لیئے مجبور ہو کر سلیمان شکوہ اور راجا جے سنگھ کو واپس بلا لیا۔

جب اورنگ زیب نے آگرے کو فتح کر لیا تو شاہجہاں سے سفارش کر کے بہار کا صوبہ شجاع کو دلوا دیا اور اس کے ساتھ ہی اسے لکھ بھیجا کہ فی الحال بہار کا صوبہ اپنے تصرف میں لائیں۔ جب ہماری فوجیں دارا کی مہم سے فارغ ہو جائیں گی اس وقت کئے گئے وعدے پورے کئے جائیں گے۔

ہر چند اورنگزیب نے بڑی فراخ حوصلگی کا مظاہرہ کیا۔ باوجود اس کے کہ شجاع کی کمزوری جو اس کے لالچی ہونے کے سبب تھی ظاہر ہو چکی تھی، مگر اورنگ زیب پھر بھی اس سے مہربانی سے پیش آیا۔

درحقیقت شاہجہاں نے ہندی میں اس کے نام جو خط لکھا تھا جس میں اسے بادشاہت کا لالچ دیا گیا تھا وہ اس فریب میں آچکا تھا اور سخت لالچی اور حریص ہونے کے سبب اس کا پیمانہ طلب ابھی تک پُر نہیں ہوا تھا چنانچہ ان عنایات کے باوجود شجاع ایک پست ہمت، بے مروّت، حریص اور بزدل انسان کی طرح ہر وقت موقع کی تلاش میں رہنے لگا۔ حتیٰ کہ عالمگیر کا پیچھا کرتے ہوئے وہ ملتان پہنچ گیا۔ اس دوران میں مراد گرفتار ہو چکا تھا اور آگرے کے قلعے میں قید تھا۔ شجاع نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہ اورنگ زیب تنہا ہے فوراً پٹنہ سے اپنی فوجوں کے کوچ کا حکم دیدیا۔

بنارس، الٰہ آباد اور رہتاس وغیرہ کے قلعے ابھی تک دارا کے ملازموں کے پاس تھے۔ دارا نے چپکے سے کہلا بھیجا کہ یہ قلعے شجاع کے سپرد کردیں۔

اب شجاع اپنے لشکر جرار کے ساتھ بڑھتا ہوا الٰہ آباد تک پہنچ گیا۔ عالمگیر کو جب اس کی پیش قدمی کی اطلاع ملی تو اس نے اپنے بیٹے محمد سلطان کو حکم دیا کہ وہ آگرہ کی موجودہ فوج کو لے کر آگے بڑھے، اس کے بعد پھر وہ خود بھی روانہ ہوا۔ جسونت سنگھ جو دھرات پور میں شکست کھا کر بھاگ نکلا تھا راجا جے سنگھ کی سفارش پر جسے عالمگیر نے معاف کر کے شریک فوج کر لیا تھا اس موقع پر عالمگیر کے ہمراہ تھا۔

۱۷ ربیع الثانی ۱۰۶۹ھ میں میدان کارزار میں فوجوں کو مرتب کیا گیا جسونت سنگھ کو بھی یمین کی کمان دی گئی لیکن اس نے لڑائی سے ایک رات پہلے شاہ شجاع سے خفیہ ساز باز کر لی۔ اور طے کیا کہ رات کو میں پیچھے سے عالمگیر کی فوج پر حملہ کروں گا۔ اور تم سامنے سے حملہ کر دینا۔ اس طرح ہم دونوں مل کر عالمگیر کا قلع قمع کر دیں گے۔

عین اس وقت عالمگیر تہجد کی نماز میں مشغول تھا لشکر میں یکایک شور اٹھا۔ پہریداروں نے آکر عالمگیر کو اطلاع دی کہ جسونت سنگھ اپنی چودہ ہزار فوج کے ساتھ شاہی لشکر کو پریشان کرتا ہوا شاہ شجاع کے پاس جا رہا ہے۔

عالمگیر نے بڑے اطمینان سے اوراد و وظائف اور معمولات سے فارغ ہو کر میر جملہ سے کہا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا احسان اور فضل و کرم ہی تو ہے، اگر یہ منافق عین میدان جنگ میں یہ حرکت کرتا تو اس کا تدارک مشکل ہو جاتا۔

عالمگیر نے اس واقعہ کی اطلاع پانے کے بعد نقارہ اور سواری کا حکم دیا۔ اور باقی رات کا حصّہ اس نے ہاتھی کی کمر پر گزار دیا۔ صبح ہوئی تو سواری خاص کے فیلبان کو حکم دیا کہ جیسے تیسے بن پڑے ہمیں شجاع کے ہاتھی کے پاس پہنچا دو۔ ہر چند بہی خواہوں نے اسے خطرناک اقدام سمجھ کر عمل نہ کرنے کا مشورہ دیا تاہم عالمگیر فیصلہ کر چکا تھا چنانچہ حکم کی تعمیل ہوئی۔

شجاع نے اس جنگ میں شکستِ فاش کھائی اور وہ بھاگ کر پٹنہ جا پہنچا عالمگیر نے اس کے تعاقب میں اپنے بیٹے محمد سلطان اور سپہ سالار میر جملہ کو بھیج دیا۔ میر جملہ نے شجاع کو شکست پر شکست دیکر بنگال چھوڑنے پر مجبور کر دیا چنانچہ وہ اپنے بیوی بچوں اور ساتھیوں کو لیکر "مگہ قوم کے ملک ارچنگ" کو چلا گیا۔ یہاں کے راجہ نے اُسے بڑے اعزاز اور احترام سے رکھا۔ لیکن شجاع نے وہاں کے مسلمانوں کے ساتھ ساز باز کر کے راجہ کے تخت پر قبضہ کرنے کے منصوبے تیار کر لئے جو عین وقت پر پکڑے گئے۔ اب راجا بے حد غضبناک ہوا اور اس نے شجاع کی گرفتاری کے لئے فوج روانہ کی۔ جیسا کہ پرتگالی تاجروں کا بیان ہے کہ وہ اسی وقت اپنے تمام خاندان کے افراد کے ساتھ قتل کر دیا گیا اس طرح غریب الوطن ہو کر نہایت بے کسی میں اس نے جان دے ڈالی۔ اور باوجود ہزار کوششوں کے جو اورنگ زیب کے حکم پر افسروں نے اس کی تلاش میں کیں۔ آج تک اس کا پتہ نہ چل سکا کہ اس کا اور اس کے خاندان کا کیا حشر ہوا ۰

رسم تخت نشینی

۱۰۶۸ھ یکم ذی قعدہ جمعہ کی نماز کے بعد اورنگ زیب کو سلطنت مغلیہ ہند کے تخت پر بیٹھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ تخت نشینی کا مادہ تاریخ قرآن حکیم کی اس آیت سے نکالا گیا اطیعو اللہ و اطیعو الرّسول و اولی الامر منکم۔ اس کے علاوہ "شہنشاہ فلک اورنگ" اور "سزاوار سریر بادشاہی" سے بھی تخت نشینی کی تاریخ نکل آتی ہے۔

تخت نشینی کی رسم کے ایک سال بعد جبکہ اورنگ زیب کے تمام دشمنوں کا قلع قمع ہو چکا تھا تاج پوشی کی رسم ادا کی گئی اور ابو المظفر محی الدین اورنگ زیب عالمگیر کا لقب اختیار کیا گیا۔ اس سے پہلے روپے اور اشرفی کے سکوں پر ایک طرف کلمہ طیبہ اور دوسری طرف خلفائے راشدین کے اسمائے مبارک ہوتے تھے اورنگ زیب عالمگیر نے اس خیال سے کہ یہ سکے جب نامناسب جگہوں پر گر پڑتے ہیں اور لوگوں کے پیروں کے نیچے آتے ہیں جس سے بے ادبی ہوتی ہے لہذا بجائے اسماء کے سکوں پر حسب ذیل شعر نقش کئے جانے کا حکم دیا۔

سکہ زد در جہاں چوں مہر منیر
شاہ اورنگ زیب عالمگیر

مُلّا شاہ کشمیر نے جو دارا شکوہ کے پیر و مرشد تھے اور اپنے زمانے کے مشہور گوشہ نشین بزرگوں میں شمار ہوتے تھے۔ اورنگ زیب عالمگیر کی تاریخ

جلوس میں ایک قطعہ کہا جو درج ذیل ہے

صحن دل من چوں گل خورشید شگفت
کامد حق و غبار باطل رفت
تاریخ جلوس شاہ حق آگہہ را !
ظل الحق، گفت الحق ایں را حق گفت

اکبر اعظم کے زمانے سے سلطنت مغلیہ کے سرکاری دفتروں میں ماہ وسال کا حساب عجمی تاریخوں میں رکھا جاتا تھا۔ نیز جشنِ نوروز بھی بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا تھا۔ اورنگ زیب نے ان باتوں کو اسلامی تہذیب کے خلاف متصور کیا۔ چنانچہ اس نے تخت پر بیٹھتے ہی عجمی ماہ وسال کی بجائے عربی ماہ وسال مقرر کئے جانے کا حکم دیا اور جشنِ نوروز کو منانے کا حکم فوراً منسوخ کر دیا۔

قتلِ مراد

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ شاہجہاں کے اسی خط کی بنیاد پر جس میں مراد کو ہندوستان کی بادشاہت سونپنے کا لالچ دے کر اورنگ زیب اور اس کی اولاد کو دعوت کے بہانے قتل کرنے پر اکسایا گیا تھا۔ دارا شکوہ کے قتل کے بعد جیسے مراد بھی اپنے حق میں خطرناک سمجھتا تھا۔ مراد کی بھی نیت

بدل گئی اور اس نے عالمگیر کو اپنے راستے سے ہٹانے کے لئے نہایت سرعت کے ساتھ فوج کی بھرتی شروع کر دی۔ حتیٰ کہ جب عالمگیر نے دارا کا پیچھا کرتے ہوئے دہلی کی راہ لی تو مراد بھی آگرہ سے اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا تا کہ وہ چپکے سے حملہ کر کے اورنگ زیب کو ختم کر ڈالے۔ عالمگیر چونکہ جانتا تھا کہ مراد بے حد لالچی ہے، اس لئے کہ اسے کسی دھوکے اور فریب کا شبہ نہ ہو اس کے پاس اڑھائی سو گھوڑے اور بیس لاکھ روپیہ بھجوا دیا۔ لیکن مراد کے رویے میں اس کے باوجود کوئی تبدیلی نہ آئی۔ بلکہ اس نے اپنے شہنشاہ ہند ہونے کا اعلان کر دیا اور اپنے افسروں کو شاہی خطابات تقسیم کرنے شروع کر دیئے۔

اس سے پہلے کہ مراد اپنے ناپاک ارادوں میں کامیابی حاصل کرتا۔ اورنگ زیب نے کمال حکمت عملی کے ساتھ اسے گرفتار کر لیا۔ ہر چند وہ بڑے سنگین جرم کا ارتکاب کر چکا تھا اور متحد رہنے کا جو عہد وہ عالمگیر سے کر چکا تھا اسے توڑ چکا تھا۔ تاہم عالمگیر نے مروت سے کام لیتے ہوئے اسے قتل کرنے کی بجائے احتیاط کے طور پر اس کی محبوبہ کے پاس گوالیار کے قلعے میں نظر بند کر دیا جہاں وہ پورے چار برس رہا۔

ہر چند مراد کو قلعہ میں ہر طرح کی آزادی حاصل تھی لیکن وہ برابر کوشش کر رہا تھا کہ وہاں سے بھاگ نکلے۔ چنانچہ اس سلسلے میں سب سے پہلے اس نے اپنے ذاتی ملازموں کو ساتھ ملایا جن میں مشہور شیعہ مؤرخ خافی خاں کا باپ بھی تھا۔ اس کے بعد اس نے ان درویش صورت مغلوں کو اپنا ہمدرد بنا لیا جو گوالیار میں رہتے تھے۔ غرض ان سب نے مراد کو قید سے بھاگ

نکلنے کیلئے بڑی مدد بہم پہنچائی۔ مگر عین اس وقت جب وہ فرار ہونے کی ٹھان رہا تھا پہریداروں کو پتہ چل گیا اور وہ پھر گرفتار کر لیا گیا۔ اگرچہ اس موقع پر بھی وہ کڑی سزا کا مستحق تھا۔ لیکن عالمگیر نے پھر بھی درگزر سے کام لیا اور بجائے قتل کرنے کے احتیاط کے طور پر قید ہی میں پڑا رہنے دیا۔

عالمگیر کا خیال تھا کہ جب حالات معمول پر آجائیں گے مراد کو برادرانہ سلوک کے ساتھ رہا کر دیا جائے گا۔ مراد کی بدقسمتی کہیئے کہ ایک سیّدزادے نے اپنے باپ علی نقی کے قصاص کا مطالبہ کر دیا جسے مراد نے شراب کے نشے میں شک و شبہ کی بنا پر ناحق قتل کر دیا تھا۔ ہر چند قاضی نے مدعی کو خون بہا لینے کی ترغیب دی لیکن وہ کسی طرح نہ مانا۔ قصاص ہی لینے پر مصر رہا۔ آخر کار عالمگیر کو قصاص کا حکم جاری کرنا پڑا۔ چنانچہ ۲۱ ربیع الثانی ۱۰۷۲ھ کو علی نقی کے جرم میں مراد کو قتل کر دیا گیا۔

❖

اصلاحات

ایسے وہ تمام امور جو اسلام کی شریعت کے خلاف تھے لیکن ملکی مصلحتوں کے تحت اکبر کے زمانے سے مغلیہ سلطنت میں رائج چلے آرہے تھے۔ اورنگ زیب نے سب سے پہلے انہی پر توجہ کی اور حالات کی اس حد تک اصلاح کر دی۔ کہ وہ اسلام کی شریعت کے عین مطابق ہوگئے۔

اصلاحات عالمگیری پر ایک نظر ڈالیں تو ماننا پڑے گا کہ اورنگ زیب

نہایت خدا ترس اور بہت ہی رعیت پرور بادشاہ تھا۔ ایسے تمام محاصل جو رعیت پروری کے تقاضے کے خلاف تھے۔ باوجود اس کے کہ ان سے حکومت کو لاکھوں روپے کی آمدنی تھی۔ یک قلم سب کے سب موقوف کر دیئے۔

ارباب نشاط مثلاً گویئے اور قوال وغیرہ جو اکبر ہی کے زمانے سے مغل دربار سے وابستہ چلے آتے تھے اور شاہان مغلیہ کی ضیافت طبع کا سامان بہم پہنچاتے تھے۔ اورنگ زیب نے انھیں گانے بجانے کی زحمت سے نجات دلا دی۔ اور آئندہ کے لئے ممانعت کر دی کہ کوئی حاکم اپنے یہاں گانے بجانے والے گویّوں، قوالوں اور کلاونت کو بالکل کوئی جگہ نہ دے۔

ایک مرتبہ گویوں اور قوالوں کی ایک جماعت ایک جنازہ لیئے آگے پیچھے ماتم کرتی اور شور مچاتی ہوئی عالمگیر کے محل کے نیچے سے گزری۔ عالمگیر نے شور و غل سُنا تو معلوم کیا کہ کیا ماجرا ہے۔ جماعت نے عرض کیا حضور، ہم مردہ موسیقی دفنانے کو لے جا رہے ہیں۔ عالمگیر نے سنجیدگی سے کہا۔

”ہاں ہاں ضرور لے جاؤ اور اسے زمین میں اس طرح دفن کر دو کہ پھر کبھی آواز نہ سننے میں آئے۔“

اس کے علاوہ ایک اور بدعت جسے اکبر نے اپنی سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر قائم کیا تھا۔ درشن کا جھروکا تھی۔ قاعدہ یہ تھا کہ بادشاہ بیمار ہو یا تندرست وہ ہر حال میں روزانہ مقررہ وقت پر درشن کے جھروکے میں آتا اور لاکھوں انسان جن میں زیادہ تر ہندو ہوتے تھے بادشاہ کے درشن کرتے اور پھر اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو جاتے تھے۔ یہ بدعت سیئہ چونکہ

ہندوؤں ہی کے خیالات کا نتیجہ تھی۔ اس لئے ہندوؤں میں اسے بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہاں تک کہ "درشنی ہندو" کے نام سے ہندوؤں میں ایک علیحدہ طبقہ پیدا ہوگیا۔ ان کا حال یہ تھا کہ وہ جب تک بادشاہ کی صورت نہ دیکھ لیتے کھانے کی کوئی شے منہ میں نہ ڈالتے تھے۔

عالمگیر ایسے توحید پرست بادشاہ نے ان بدعتوں کو جسے اس کے دادا اکبر نے قائم کر کے دین اسلام کی عظمت کو پامال کیا تھا ایک سعادتمند پوتے اور سچے مسلمان ہونے کی حیثیت سے پائے حقارت سے ہٹا کر اسلام کے جھنڈے کو مغل سلطنت کے در و دیوار پر بلند سے بلند تر کر دیا۔

شاعروں اور نجومیوں کو جنہیں سلطنت مغلیہ کے ہر زمانے میں بڑے بڑے اعزاز و مناصب حاصل تھے۔ عالمگیر نے انھیں توضیع اوقات کا موجب خیال کر کے سابقہ رواج کو ختم کر دیا۔ زائچہ اور نجوم وغیرہ جنہیں جزو لازم خیال کیا جاتا تھا اسے اسلامی تعلیمات کے خلاف قرار دے دیا۔

عالمگیر نے دین داری کے جذبے سے جو قدم اٹھایا اس میں تمام تر مصلحتہً روح کار فرما رہی۔ ذاتی پسند و ناپسند کا کہیں شائبہ تک نہیں۔ یہ دین ہی کی سربلندی اور اس کے فروغ و اشاعت کا جذبہ تھا کہ عالمگیر نے تمام امراء وزراء اور سرداروں کے مقابلے میں قاضیوں اور عالموں کا مرتبہ اس قدر بڑھا دیا اور انھیں اس قدر اختیارات دیدیئے کہ سلطنت کے بڑے بڑے ارکان ان سے رشک و حسد کرنے لگے۔

عالمگیر کی دینداری، رعیت پروری اور عدل گستری کا اس سے بڑھ کر اور

کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ اس نے تمام سلطنتِ مغلیہ میں یہ اعلان کر دیا کہ جس کسی کو بادشاہ کے خلاف کوئی شکایت یا شرعی دعویٰ ہو وہ بادشاہی وکیل سے رجوع کر کے اپنا معاملہ صاف کر لے۔ اس کے علاوہ جو لوگ کسی مجبوری کے سبب دارالحکومت میں پہنچنے سے معذور ہوں ان کی سہولت کے لئے شرعی وکیل مقرر کر دیئے۔

جن دنوں یہ فرمان جاری ہوا تھا کہ بادشاہ کے خلاف قاضی کی عدالت میں استغاثہ دائر کیا جا سکتا ہے۔ سورت کے ایک حاجی زاہد مرحوم کے بیٹے محمد محسن نے بادشاہ کے خلاف پانچ لاکھ روپے کی رقم جو اس کے بھائی مراد بخش کو قرض دی گئی تھی ادا نہ کرنے کا مقدمہ درج کروا دیا۔ تاجر مذکورہ کا دعوٰے یہ تھا کہ فتاویٰ عالمگیری میں جو عالمگیر ہی کے نام سے منسوب ہے جیسا کہ تحریر ہے کہ اگر میت کے متروکہ پر اس کا کوئی وارث متصرف ہو جائے تو میت کے قرض کا ادا کرنا بھی اس پر لازم آتا ہے۔ لہٰذا مراد بخش نے احمد آباد میں اپنے نام کا خطبہ و سکہ جاری کیا اور بندرگاہ کے تاجروں سے پانچ لاکھ روپے کی رقم قرض کے طور پر طلب کی تھی۔ جس کی تمام تاجروں کی طرف سے تنہا میرے باپ حاجی زاہد نے تعمیل کی اور پانچ لاکھ روپیہ دے دیا مگر وہ روپیہ چونکہ مراد بخش کے استیصال کے بعد آپ کے شاہی خزانے میں چلا گیا۔ اس لئے اب آپ کے اوپر لازم آتا ہے کہ قرض مذکورہ ادا کریں۔

بادشاہ نے اس پر ثبوت مانگا۔ محمد محسن نے اپنے دعوے کو مرتب کر کے ثبوت پیش کر دیا۔ اس کے علاوہ اس نے وہ فرد حساب بھی پیش کی جو شاہی خزانے میں اس عبارت کے ساتھ محفوظ تھی کہ محمد مراد بخش کے اموال کے منجملہ

پانچ لاکھ اشرفیاں بابت قرض حاجی زاہد تاجر سورت بحق سرکار ضبط کی گئیں۔

عالمگیر نے کاغذات کا مطالعہ کرنے کے بعد کچھ دیر معاملے کے تمام پہلوؤں پر غور کیا۔ ابھی وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ تاجر مذکور نے اندازہ کر کے کہ عالمگیر اس کی رقم کو واپس کرنے کو تیار ہے اور پھیر دینے کا حکم دیا چاہتا ہے۔ وہ ہاتھ جوڑ کر بولا:

"حضور! میری گذارش کا مقصد تو فقط اتنا ہی تھا کہ میرا حق واضح ہو جائے۔ رہی بات رقم کی تو لیں اُسے آپ ایسے خدا پرست اور دیندار بادشاہ کی خدمت میں رعیت کی بھلائی پر خرچ کرنے کے لئے بطورِ نذرانہ پیش کرتا ہوں"

عہد عالمگیری سے پہلے قاعدہ تھا کہ جب کوئی مغل دربار کا امیر مر جاتا۔ تو اس کے مرتے ہی تمام جاگیر بحق سرکار ضبط کر لی جاتی تھی۔ اس اقدام سے مرنے والے کے لواحقین سخت مشکل میں پڑ جاتے تھے۔ عالمگیر نے اس قاعدے کو جذبۂ ترحم کے خلاف پایا اور منسوخ کر دیا۔

شاہزادہ محمد معظم شاہ عالم جسے عالمگیر نے مصالح ملکی کے تحت نظر بند کیا تھا۔ ہر چند قید میں ضرور تھا لیکن شفقتِ پدری سے ہرگز محروم نہ تھا۔ ایک روز عالمگیر نے اپنے ایک محرم راز کے ہاتھ شہزادے کے پاس ایک قلمدان بھجوایا جس میں ضروری چیزوں کے علاوہ ایک چاقو بھی تھا۔ چونکہ چھری، چاقو یا کسی اور قسم کا چھوٹا بڑا حربہ، اوزار قید میں رکھنا خلاف ضابطہ تھا۔ اس لئے عالمگیر نے اپنے محرم راز کو تاکید کر دی کہ تم دیکھتے رہنا شاہزادہ قلمدان پانے کے بعد کیا کرتا ہے۔

اگر وہ قلمدان کھولنے کے بعد چاقو رکھتے میں تامل کرے تو اسے تم بتا دینا کہ یہ چاقو بادشاہ نے جان بوجھ کر خود اپنے ہاتھ سے رکھا ہے اور اگر وہ بے تامل چاقو رکھ لے تو اس سے کچھ نہ کہنا۔ چپکے سے میرے پاس چلے آنا۔

چنانچہ شاہزادے نے جب قلمدان کھولا اور جونہی اس نے چاقو دیکھا ہاتھ پیچھے ہٹا لیا اور اس کی طرف اشارہ کر کے کہا شاید یہ غلطی سے آگیا۔ اس شخص نے کہا۔ نہیں یہ بادشاہ نے خود اپنے ہاتھ سے رکھا ہے۔ اور مجھے بتا بھی دیا تھا۔

جب عالمگیر کا محرم راز شہزادے سے مل کر واپس آیا اور آکر کیفیت بیان کی تو عالمگیر نے کہا۔ ہم اپنے بیٹوں کی غیرت کو خوب جانتے ہیں۔ پھر چند روز کے بعد بادشاہ عالمگیر نے بیٹے کو رہا کرنے کا ارادہ کرتے ہوئے اسے ایک تحریر بھیجی جس میں حدیث نبوی کا یہ حوالہ دیا کہ قرآن حکیم کا حافظ اگرچہ عمر قید کا سزادار ہو تاہم اسے عمر قید کی سزا نہیں دی جاسکتی۔ ماشاءاللہ شاہزادے کو بھی ہزاروں حدیثیں یاد تھیں۔ خط کا مضمون پڑھ کر اور یہ سمجھ کر کہ اب آبا حضور قید سے رہا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں عالمگیر کے خط کے جواب میں یوں تحریر کیا کہ حافظِ قرآن کو حبسِ دوام کی سزا نہیں دی جاسکتی۔ مگر باپ حفظِ قرآن حکیم کے احترام کے باوجود بیٹے کو ہمیشہ کے لئے قید میں رکھ سکتا ہے۔

بیٹے نے باپ کی نقل کردہ حدیث کا جواب حدیث ہی کے حوالے سے پیش کر دیا۔ عالمگیر اس جواب پر بے حد خوش ہوا اور شہزادے کے حال پر پہلے سے بھی زیادہ مہربان ہو گیا۔

وفات عالمگیر

جوں جوں عمر بڑھتی گئی کام کی زیادتی اور سخت محنت کے سبب توں توں بیماری اور کمزوری عالمگیر کو گھیرتی رہی۔ حتیٰ کہ سفر کا وقت قریب آگیا۔ عالمگیر تین چار دن سخت بخار میں مبتلا رہا۔ خافی خان لکھتا ہے۔

"باوجود شدید علالت کے عالمگیر پانچ وقت کی نماز باجماعت ادا کرتے رہے یہ بلاشبہ ان کے متقی اور پرہیزگار ہونے کا بیّن ثبوت ہے۔"

اس دوران میں حمید الدین خاں نے نجومیوں کی تجویز پر ایک ہاتھی اور ایک قیمتی الماس صدقہ دینے کی عرضداشت پیش کی۔ بادشاہ نے اس پر یہ تحریر کیا کہ

"ہاتھی صدقہ میں نکالنا ہندوؤں اور ستارہ پرستوں کا طریقہ ہے۔"

اور اس کے بجائے چار ہزار روپیہ قاضی القضاۃ کے پاس بھجوادیا۔ کہ مستحقوں کو دے دیا جائے۔ اسی درخواست پر یہ بھی لکھا۔ کہ اس خاکسار کو پہلی منزل پر پہنچنے کے بعد سپردِ خاک کر دیا جائے تابوت کو زینت نہ بنایا جائے۔

۱۱۱۸ھ میں جمعہ کے دن بادشاہ نے صبح کی نماز ادا کی اور کلمۂ توحید کے ذکر میں مشغول ہو گئے۔ دن کا کچھ حصّہ گزرا تھا کہ بادشاہ کی روح عالم بقا کی طرف پرواز کر گئی۔ اس وقت عمر نوّے سال چند ماہ تھی۔ پچاس برس ڈھائی مہینے بادشاہت کی۔

(ماخوذ منتخب اللباب خافی خاں)

وصیّت نامہ عالمگیری

اوّل اینکہ ایں عاصی غرق معاصی را تلحیف و تلفریش تربت مطہرہ مقدسہ حینیہ علیہ السلام نمائیند کہ معز خاں مجر عصیاں را بغیر از التجاباں درگاہ مرحمت و غفران پناہ نیست مصالح دیں سعادتِ عظمےٰ نزد فرزند ارجمند بادشاہزادہ عالیجاہ ست بگیرند۔

دوم آنکہ۔ چہار روپیہ دو آنہ از وجہ کلاہ دوزی نزد آیہ بیگم محلدار ست بگیرند و صرف کفن ایں بے چارہ نمائید و سہ صد پنج روپیہ از وجہ کتابت قرآنِ مجید در صرف خاص ست، روزِ وفات بفقرا دہند ازیں راہ از کتابت قرآں نزد فرقہ شیعہ حرمت دارد۔ بکفن و مابحتاج آں صرف نہ کنند۔

سوم آنکہ۔ باقی مایحتاج از وکیل بادشاہزادہ عالیجاہ بگیرند کہ وارث قریب و اولاد ایشاں اند و حلت و حرمت بر ذمہ ایشاں است بریں بے چارہ بازپرس نیست کہ مردہ بدست زندہ۔

چہارم آنکہ۔ ایں سرگشتہ وادی گمراہی را سر برہنہ دفن کنند کہ ہر گنہگار تباہ روزگار کہ سر برہنہ نزد بادشاہ عظیم الشان ببرند۔ البتہ محل ترحم خواہد گردید۔

پنجم آنکہ۔ بر بالائے صندوق تابوت پارچہ سفید گندہ کہ گزی گویند پوشش نمائید پوشش نمائیند از شامیانہ و بدعت مغنیاں و مولودی احتراز کنند۔

ششم آنکہ۔ بر والیِ ملک واجب باد کہ با خانہ زادان بے سر و پا کہ ہمراہ ایں عاصی (دور از حیا م) در دست و صحرا گشتہ اند مدارات نمایند و اگر بتصریح تقصیرے

از اینہا واقع شود بعفو جمیل و صفح جزیل مکافات فرمایند۔

ہفتم آنکہ۔ بہتر از ایرانی برائے متصدی گرمی دیگرے نیست و در جنگ ہم از عہد حضرت جنت آشیانی تا حال آمدے ازیں فرقہ از معرکہ روگرداں نشدہ و پائے استقامت اینہا نہ لغزیدہ معہذا گاہے خودسری و حرام نمکی نہ کردہ اند لیکن چوں بسیار عزت طلب اند با اینہا ساختن بسیار مشکل بہر حال باید ساخت و کجدار مریز باید کرد۔

ہشتم آنکہ۔ فرقہ تورانی سپاہے مقرر اند و برائے تاخت و تاراج و شبخون و قیدی کردن خوب اند از برگشتن در عین جنگ کہ ترجمہ تیر باز کشی است وسواس و ہراس و خجالت ندارند و از جہل مرکب ہندوستان زایاں کہ سربرود لیکن جا نرود بعد مرحلہ دور اند۔ بہر حال ایں جماعت را محل رعایت باید داشت کہ اکثر جاہا ایں مردم بکار می آیند کہ دیگرے بکار نمے آید۔

نہم آنکہ۔ با مساوات لازم السعادت بارہ بموجب آیہ کریمہ وات ذالقربی حقہ عمل باید نمود۔ حد احترام و رعایت خرد گذاشت نباید کرد۔ ازیں راہ کہ بموجب آیہ کریمہ قل لا اسئلکم علیہ اجرا المودۃ فی القربیٰ محبت ایں جماعت اجر نبوت است۔ ہرگز مقصر نباید بود کہ ثمر خیر دنیا و آخرت لیکن با مساوات بارہ کمال احتیاط باید نمود در محبت باطنی قصور نباید کرد۔ و بحسب ظاہر مرتبہ اینہا نباید افزود کہ شریک غالب بلکہ طالب ملک اند۔ اگر اندک استرخاء عناں شود ندامت نخواہد شد۔

دہم آنکہ۔ تا مقدور والئ ملک خود را از حرکت معاف ندارد و از نشستن در یک مکاں کہ در ظاہر صورت آرام و در واقع منجر بہتر از مصیبت و آرام ست محترز باشد۔

یازدہم۔ برلپسراں ہرگز اعتماد نہ کند وطور مصاجبت در زندگی نہ نماید کہ اگر اعلیٰ حضرت با دارا شکوہ چنیں سلوک نمے کردند کار بایں جا نمے رسید وکلمۃ اللہ عقیمۃ ہمیشہ مد نظر باید داشت۔

دوازدہم۔ عمدہ رکن السلطنت اطلاع اخبار ملکی ست وغفلت یک لحظہ باعث ندامت سالہا دراز می گردد۔ کہ مقدمہ گریختن سیوا مقہور از غفلت شدہ تا آخر عمر ہماں سرگرداں باقی بود۔

مبارک اثنا عشر اختتام بر دوازدہ وصیت کردہ شدہ"

اگر دریافتی بر دانشت بوس

وگر غافل شدی افسوس افسوس

(حوالے کیلئے دیکھیئے وقائع عالمگیر صفحہ ۱۲۷ تا ۱۳۰)

ایک ہندو مؤرخ جادو ناتھ سرکار کی رائے

اورنگ زیب عالمگیر کی تاریخ عملاً ہندوستان کی ساٹھ سال کی تاریخ ہے، خود اس کا عہد حکومت (۱۶۵۸ء تا ۱۷۰۷ء) سترھویں صدی کے نصف آخر پر حاوی ہے اور ہمارے ملک کا اہم ترین تاریخی زمانہ ہے، یہ اسی بادشاہ کا دور مسعود تھا جب کہ حکومت مغلیہ اپنے انتہائی عروج کو پہنچی، اور ابتداء عہد تاریخ سے برطانوی حکومت کے قیام تک کے زمانے میں یہ شاید واحد حکومت ہے جس نے اتنی وسعت حاصل کی۔

غزنی سے لے کر چاٹگام تک اور کشمیر سے لیکر کرناٹک تک تمام ملک

ایک ہی فرمانروا کے زیرِ نگیں تھا۔ اور لادک، مالابار کے دور دراز مقامات پر بھی اسی بادشاہ کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔ اسلام کی آخری سب سے بڑی ترقی کا یہی زمانہ تھا۔

اس طرح سے جو حکومت قائم ہوئی تھی۔ ایک سیاسی وحدت تھی۔ اس کے مختلف قطعات پر ماتحت حکمرانوں کا تسلط نہ تھا۔ بلکہ بلا واسطہ بادشاہ کے ماتحت تھے۔ اور اس حیثیت سے اورنگ زیب کی ہندوستانی حکومت اشوک، سمدر گپت یا ہرشوردھن کی حکومت سے وسیع تر تھی۔ اس وقت تک کسی صوبہ میں بھی کوئی شخص ایسا پیدا نہیں ہوا جو شہنشاہ دہلی کے احکام سے سرتابی کر سکتا۔

وہ مقام جہاں عالمگیر کی ابدی آرام گاہ واقع ہے خلد آباد کہلاتا ہے۔ خلد آباد اورنگ آباد سے آٹھ میل اور دولت آباد سے تین میل کے فاصلے پر ہے۔ یہاں حضرت شیخ زین الدینؒ کا مقبرہ ہے جو اربابِ طریقت میں بڑے صاحب مقام ولی تھے۔ اورنگ زیب عالمگیر کو اسی مقبرے میں دفن کیا گیا جس میں اس نے اپنے دفن کئے جانے کی وصیت کی تھی اور وہاں اپنی زندگی ہی میں اپنے لئے قبر تیار کرائی تھی۔

عمومی رائے

ہر چند خافی خاں نے اورنگ زیب عالمگیر علیہ الرحمہ کے بارے میں بے حد تعصّب سے کام لیا ہے اور اکثر واقعات ایسے رنگ میں بیان کر دیئے ہیں جس سے عالمگیر کی خفّت کا پہلو نکلتا ہے۔ تاہم اتنا کچھ کرتے دھرتے وہ بھی اس بات کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو گیا کہ تیموری خاندان میں بلکہ دہلی کے شاہانِ سلف میں بھی عالمگیر ایسا بادشاہ نہیں گزرا۔ جو عبادت و ریاضت اور عدل گستری میں اپنا مقام رکھتا ہو۔ شجاعت، بردباری اور اصابت رائے میں عالمگیر بادشاہ کا کوئی ثانی نہیں، مگر شرع کی رعایت کے سبب تادیب و سزا کا حکم نہیں دیتا تھا اور ملک کا نظم و نسق بغیر تادیب و سزا کے قائم نہیں رہ سکتا۔ لہٰذا اسی نرمی اور مشفقانہ طرزِ عمل سے امراء میں باہمی نفاق اور دشمنی رہتی تھی۔ یہی وہ کمزوری تھی جس کے سبب کوئی تدبیر اور منصوبہ جو اصلاح احوال کے لیئے پیش کیا جاتا تھا کامیاب ثابت نہیں ہوتا تھا۔

اورنگ زیب عالمگیر علیہ الرحمہ کے باوجود نوّے سال کی عمر کو پہنچنے کے ہوش و حواس قائم رہے۔ صرف سماعت پر کچھ اثر تھا۔ لیکن اس کا بھی دوسروں کو پتہ نہیں چلتا تھا۔ اورنگ زیب عام طور پر شب بیدار اور عبادت گزار بادشاہ تھا۔ اکثر دنیوی لذات جو انسان کے لیئے ضروری ہیں عالمگیر نے ترک کر دیئے تھے۔

مآثر عالمگیری کا مصنف محمد ساقی مستعد خاں جو برس ہا برس اورنگ زیب عالمگیر کے ساتھ رہا اور اس نے پورے ۴۰ سال تک عالمگیری دربار میں وقائع

نگاری کی خدمت انجام دی ہے وہ اپنی مشہور عالم اور مستند کتاب مآثر عالمگیری میں جو کچھ لکھتا ہے وہ سب کا سب اس کے اپنے آنکھوں دیکھے حالات پر مبنی ہے۔ اس اعتبار سے کہ مآثر عالمگیری کے مصنف کو اورنگ زیب کی رفاقت میں رہنے سے اورنگ زیب کی شخصیت اور کردار کے ایک ایک پہلو کا کھلا موقع میسر آیا ہے۔ اورنگ زیب کی سیرت کے باب میں مآثر عالمگیری حرف آخر کی حیثیت رکھتی ہے۔

مآثر عالمگیری کا مصنّف اورنگ زیب عالمگیر کے مذہب وعقائد اور خیالات کے بارے میں جو بیان پیش کرتا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ عالمگیر نہایت راسخ العقیدہ مسلمان اور مرد مومن تھا۔ وہ مذہباً سُنّی تھا اور اسلامی فرائض کو نہایت پابندی کے ساتھ ادا کرتا تھا۔

عالمگیر عام طور پر باوضو رہتا تھا۔ کلمہ طیبہ اور دوسرے وظائف ہر وقت اس کی زبان پر جاری رہتے تھے۔ فجر کی نماز مسجد میں جماعت کے ساتھ ادا کرتا تھا۔ ہر ہفتہ میں شنبہ، پنج شنبہ اور جمعہ کے دن روزہ رکھتا تھا۔ جمعہ کی نماز تمام مسلمانوں کے ہمراہ ادا کرتا تھا۔ عالمگیر کا معمول تھا کہ اپنے محل کی مسجد میں تمام رات اولیاء اللہ کے ساتھ گفتگو میں مصروف رہتا۔

زکوٰۃ کی رقم شرعی حیثیت سے ادا کرنے میں پورے پورے اہتمام کرتا۔ تخت نشیں ہونے سے پہلے بھی زکوٰۃ اپنی ضروریاتِ زندگی کے خرچ سے ادا کرتا۔ اس کے علاوہ عہد حکومت میں ذاتی مصارف کے لئے جو چند گاؤں مخصوص کر رکھے تھے ان کی زکوٰۃ بھی خود ادا کرتا تھا اور اپنی اولاد امجاد کو بھی تاکید کی

کہ زکوٰۃ کا نصاب مکمل طور پر ادا کریں۔

رمضان کا مہینہ آتا تو تراویح وغیرہ عبادات میں اولیاء و علماء کے ساتھ دوپہر رات تک مشغول رہتا۔ رمضان المبارک کے آخری عشرے میں مسجد میں اعتکاف کرتا۔ حج بیت اللہ جس کے ادا کرنے کا اسے بے حد اشتیاق رہا، اگرچہ مصروفیاتِ ملکی کے سبب ادا کرنے سے محروم رہا تاہم اس سلسلے میں حاجیوں کے لئے جو رعائتیں اس نے مخصوص کر رکھی تھیں ان کے پیشِ نظر یقیناً کہا جا سکتا ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک حج کا ثواب اورنگ زیب عالمگیر کے نامۂ اعمال میں لکھ دیا۔

اس کے علاوہ ہر سال اور کبھی کبھی دوسرے اور تیسرے سال کے بعد مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے زائرین و مجاورین کے لئے بڑی بڑی رقمیں بھیجتا، اور حاجیوں کا ایک گروہ کثیر بادشاہ کی نیابت میں طواف حج وسلام رسانی وغیرہ خدمات عبادت میں ہمیشہ مصروف رہتا۔ علاوہ ازیں ایک جماعت مسجد نبویؐ میں اورنگ زیب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے قرآن حکیم کے دو نسخوں کی تلاوت کرتی تھی۔ اورنگ زیب نے قرآن حکیم کی خود اپنے ہاتھ سے کتابت کر کے اس کی دو جلدیں اسی مقصد کے لئے حرم نبویؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں رکھوا دیں تھیں کہ لوگ اس کی تلاوت کریں اور اس کے حق میں دعائے مغفرت کیا کریں۔

حقیقت یہ ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر کی ذات ستودہ صفات جامع حسنات تھی۔ اورنگ زیب عالمگیر نے ابتدائے سن تمیز سے تمام مکروہات و محرمات سے شدید پرہیز کیا۔ اور منکوحہ بیویوں کے سوا کسی

غیر محرم عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔

بارگاہ شاہی میں نغمہ و سرود کے کامل استاد ہر وقت موجود رہتے تھے۔ لیکن اورنگ زیب عالمگیر ان کیطرف بہت کم متوجہ ہوتا تھا۔ ابتداء میں تو کبھی کبھی نغمہ و سرود سے محظوظ ہو لیتا لیکن آخر میں اس سے بھی توبہ کر لی۔

• ارباب نشاط میں سے جو شخص گانے بجانے کے پیشے کو ترک کر دیتا عالمگیر اس کی گزر بسر کے لئے کچھ جاگیر عطا کر دیتا تھا۔ ایک مرتبہ مرزا مکرم خاں صفوی نے جو موسیقی کا ماہر کامل تھا اورنگ زیب عالمگیر سے پوچھا کہ نغمہ و سرود کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ اورنگ زیب عالمگیر نے کہا جو اس کے اہل ہیں ان کے لئے حلال ہے۔ مرزا نے عرض کیا آپ باوجود اہل ہونے کے اس سے پرہیز کیوں فرماتے ہیں؟ اورنگ زیب عالمگیر نے کہا راگ، راگنیاں بغیر مزامیر اور خاص کر پکھاوج کے مزا نہیں دیتیں اور مزامیر بالاتفاق حرام ہیں۔ مزامیر کی حرمت کے سبب میں نے نغمہ و سرود سے بھی علیحدگی اختیار کر لی۔

اورنگ زیب نے عمر بھر کبھی شرع کے خلاف کوئی لباس نہیں پہنا اور نہ کبھی چاندی اور سونے کے برتنوں میں کھانا کھانے کو پسند کیا۔ لہذا اورنگزیب کے مشرع اور متقی ہونے میں کوئی کلام نہیں۔

اورنگ زیب کی مجلس میں قاعدہ تھا کہ کوئی شخص کسی کی عیب جوئی اور غیبت نہ کرے اور اگر کسی شخص کے عیب کو بیان کرنا ہی لازم آئے تو ایسا انداز اختیار کیا جائے کہ اس میں عیب جوئی کا رنگ نہ پیدا ہو۔

اورنگ زیب عالمگیر کا یہ دستور تھا کہ روزانہ دو یا تین مرتبہ منظر عام پر کھڑا ہو جاتا اور داد خواہ کسی رکاوٹ کے بغیر خدمت میں حاضر ہوتا اور اپنا معاملہ پیش کرتا۔ عالمگیر نہایت شفقت کے ساتھ اس کے حالات کو سنتا اور نہایت نرمی اور ملائمت کے ساتھ اس کا مناسب جواب دیتا۔ بعض اوقات سائل عرض مدعا میں بے تکلفی کی حد سے بھی گزر جاتا مگر عالمگیر بڑے تحمل اور بردباری سے کام لیتا اور ہرگز چیں بہ جبیں نہ ہوتا۔ اگر بہی خواہوں نے عالمگیر سے بارہا عرض کیا کہ اہل غرض کا یہ اندازِ گفتگو مناسب نہیں۔ وہ عرض حال میں اکثر بے ادبی کر جاتے ہیں۔ آپ اس کی ممانعت فرمائیں۔ اورنگ زیب نے ہمیشہ یہی جواب دیا کہ سائل کو جھڑکنا اور اس طرزِ عمل سے روکنا مناسب نہیں۔ ان کی گفتگو کے اس انداز سے میری اصلاح ہوتی ہے اور وہ میرے نفس کو بردباری اور تحمل کا خوگر بناتی ہے۔

غیر مسلم افراد میں جو شخص مسلمان ہوتا اورنگ زیب عالمگیر خود اسے کلمہ طیبہ کی تلقین کر کے خلعت عطا کرتا۔ اورنگ زیب عالمگیر کا اسلام سے جتنا دلی تعلق تھا اس کا اندازہ ان بے شمار مساجد سے کیا جا سکتا ہے جو صرف اورنگ زیب عالمگیر کے عہدِ حکومت ہی میں تعمیر ہوئیں۔

غیر مسلموں پر جزیہ مقرر کرنا عہد عالمگیری کا وہ شاندار کارنامہ ہے جو اس سے پہلے کسی مسلمان فرمانروا سے انجام نہ پا سکا۔ اس کے علاوہ جس قدر خیرات و برات اور علماء فضلاء کے وظائف عہد عالمگیری میں مقرر ہوئے سابقہ حکومتوں میں اس کا عشر عشیر بھی دکھائی نہیں دیتا۔ رمضان المبارک کے مہینے میں

کم سے کم ساٹھ ہزار روپے محتاجوں اور مستحق لوگوں میں تقسیم کیے جاتے تھے۔
غریبوں، مسکینوں اور بیواؤں کی امداد کے لیے تمام ملک میں خیرات خانے قائم کیے۔ ممالک محروسہ میں جہاں کہیں مسافروں کے ٹھہرنے کے لیے سرائیں نہیں تھیں وہاں سرائیں تعمیر کروائیں۔
تمام ممالک محروسہ کی مسجدوں کی ترمیم اور ان میں پیش امام اور مؤذن کا تقرر عالمگیری حکومت کی طرف سے ہوتا تھا۔ اور اس مد پر ہر سال ایک رقم کثیر صرف ہوتی تھی۔ سلطنت کی وسعت کے باوجود اس کا پورا پورا انتظام کیا گیا۔ ملک کے ہر شہر اور ہر قصبے میں مدرسین کے وظیفے اور علماء کے روزینے مقرر کیے گئے اور انہیں گراں قدر جاگیریں بھی عطا کی گئیں۔ طالب علموں کی گزر بسر اور ان کے اخراجات کی کفالت کا معقول انتظام کیا گیا۔
جس زمانے میں اورنگ زیب عالمگیر بلخ میں عبدالعزیز خاں کے مقابلے میں صف آرا تھا اور دشمن عالمگیر کی فوج کو چاروں طرف سے گھیر چکا تھا نماز کا وقت آگیا۔ اورنگ زیب نے ارادہ کیا کہ عین لڑائی کے میدان میں نماز کا فریضہ ادا کر لے۔ بڑے بڑے امراء نے قضا کر کے ادا کرنے کا مشورہ دیا۔ کہا کہ یہ بڑا نازک موقع ہے اس وقت آپ کا ادائے نماز میں مشغول ہونا خطرے سے خالی نہیں۔ لیکن اورنگ زیب عالمگیر نے ان کی بات پر بالکل کوئی توجہ نہ دی۔ سواری سے نیچے اترا اور بڑے اطمینان و سکون کے ساتھ نماز میں مشغول ہو گیا۔
عبدالعزیز خاں والئ بخارا نے جب یہ واقعہ سنا تو عالمگیر کی شجاعت و بہادری کا اندازہ کر کے بے حد حیران ہوا۔ حتیٰ کہ جنگ سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ کہا کہ

جس شخص کی دینداری اور بہادری کا یہ عالم ہے اس سے جنگ کر کے فی الواقع اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔

ہمارے نزدیک اورنگ زیب عالمگیرؒ کے فضائل و مناقب میں جو شے اہم ہے وہ اورنگ زیب کا قرآن حکیم کا حافظ ہونا اور اس کی تلاوت کا خصوصی اہتمام کرنا ہے۔

اورنگ زیب عالمگیر نے قرآن حکیم کے دو نسخے جو اپنے ہاتھ سے لکھ کر مدینۃ النبیؐ میں بھجوائے تھے۔ ان کی جلد بندی اور جدول کی زیب و زینت پر مبلغ سات ہزار روپے صرف کئے تھے۔ علاوہ ازیں اورنگ زیب عالمگیر کی ایک فضیلت یہ بھی ہے جو اسے تمام مسلمان بادشاہوں سے ممتاز کرتی ہے عالمگیر کو فن خوشنویسی اور انشاء پردازی میں بھی کمال حاصل تھا۔

اولاد

عالمگیر علیہ الرحمہ کے پانچ بیٹے اور پانچ بیٹیاں تھیں۔ عالمگیر نے ان سب کی تعلیم و تربیت بڑے اہتمام سے کی۔ تمام شاہزادے قرآن حکیم کے حافظ، اور علوم دینی میں کامل مہارت رکھتے تھے۔ نیز ترکی و فارسی زبان بھی انہیں خوب آتی تھی وہ ان زبانوں میں تقریر و تحریر پر مکمل مہارت رکھتے تھے۔

علاوہ ازیں شاہزادیاں بھی تلاوت و کتابت قرآن حکیم میں دن رات مشغول رہتیں، نہایت پابند صوم و صلوٰۃ تھیں۔ اور دین کے احکام کی پوری پوری واقفیت

رکھتی تھیں۔

بیٹوں کے نام یہ ہیں۔ محمد سلطان[۱] ۱۰۴۵ھ میں ملکہ نواب بائی کے بطن سے پیدا ہوا۔ باپ کی زندگی ہی میں وفات پائی محمد معظم[۲] عالم شاہ ۱۰۵۰ھ میں نواب بائی کے بطن سے پیدا ہوا۔ محمد اعظم[۳] شاہ عالی ۱۰۶۲ھ میں دل رس بانو بیگم دختر شاہ نواز خاں صفوی کے بطن سے پیدا ہوا۔ محمد اکبر[۴] ۱۰۶۲ھ دل رس بانو بیگم کے بطن سے پیدا ہوا۔ محمد کام بخش[۵] ۱۰۷۷ھ میں بائی اودے پوری کے بطن سے پیدا ہوا۔

بیٹیوں کے نام یہ ہیں (۱) زیب النساء بیگم ۱۰۴۸ھ میں دل رس بیگم کے بطن سے پیدا ہوئی۔ قرآن مجید کی حافظ تھی۔ عالمگیر نے اسے تیس ہزار اشرفیاں قرآن حکیم حفظ کرنے کی خوشی میں بطور انعام عطا کیں۔ اس شاہزادی کے حکم سے ملا صفی الدین اردبیلی نے قرآن حکیم کی تفسیر کبیر کا زیب التفاسیر کے نام سے عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا۔ عالمگیر کی زندگی ہی میں ۱۱۱۳ھ میں اس نے وفات پائی

(۲) زینت النساء بیگم ۱۰۵۳ھ میں دل رس بانو بیگم کے بطن سے پیدا ہوئی قرآن حکیم کی حافظ تھی۔

(۳) بدر النساء بیگم ۱۰۵۷ھ میں نواب بائی کے بطن سے پیدا ہوئی۔ قرآن حکیم کی حافظ تھی۔ علم کے ساتھ عمل کو بھی ملحوظ رکھتی تھی۔

(۴) زبدۃ النساء بیگم۔ ۱۰۶۱ھ میں دل رس بانو بیگم کے بطن سے پیدا ہوئی نہایت عابدہ و زاہدہ تھی۔

(۵) مہر النساء بیگم۔ ۱۰۷۲ھ میں اورنگ آبادی محل کے بطن سے پیدا ہوئی۔

اورنگ زیب عالمگیر کے شب و روز

اورنگ زیب عالمگیر بحیثیت ایک حکمران کے شعور و آگہی کی کس منزل میں تھا اس کی زندگی کے شب و روز کیسے گزرتے تھے۔ اس کی مصروفیات کا کیا عالم تھا۔ جب ہم اس کے زمانے کی تاریخ پر ایک نگاہ ڈالتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ عالمگیر طلوع صبح سے پہلے بیدار ہوتا ہے۔ غسل اور وضو سے فارغ ہو کر دیوان خاص سے ملحقہ مسجد میں جا کر بیٹھ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ فجر کی نماز کا وقت آجاتا ہے۔ بادشاہ اپنی جگہ سے اٹھتا ہے اور قلعہ کے دوسرے تمام چھوٹے بڑے ملازموں کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر ایک ہی صف میں کھڑے ہو کر اللہ تعالیٰ کے حضور میں سجدہ ریز ہو جاتا ہے۔

باجماعت نماز ادا کرنے کے بعد بادشاہ اپنے کتب خانے میں چلا آتا ہے اور وہاں کچھ دیر بیٹھ کر قرآن حکیم کی تلاوت کرتا ہے۔ پھر فقہ، حدیث اور تفسیر کی کتابوں کا مطالعہ کرتا ہے۔ جب صبح کے ساڑھے سات بجتے ہیں، تو داد خواہی کے کام کو انجام دینے کے لیے دیوان خانے میں چلا آتا ہے۔ یہاں فریادی باری باری اپنی شکایات بادشاہ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ اور بادشاہ نہایت عدل و انصاف کے ساتھ وہیں فیصلہ صادر کر دیتا ہے۔ اگر غریب و مفلس و قلاش لوگ اس کے حضور میں پیش ہوتے ہیں تو بغیر کسی توقف کے شاہی خزانے سے ان کی ضرورت پوری کر دی جاتی ہے۔

درشن جھروکہ جس کا طریقہ شاہجہان نے جاری کیا تھا۔ بعض مصلحتوں کو سامنے رکھتے ہوئے اورنگزیب نے بھی کچھ دیر جاری رکھا۔ بادشاہ صبح ساڑھے آٹھ بجے درشن جھروکے میں آتا، پھر فوج کے سپاہی آتے جنگی کرتب دکھاتے، ہاتھی لڑائے جاتے، جنگی مشق کی جاتی، تیر اندازی ہوتی۔ اگرچہ شاہی فوج کی تربیت کے لیے یہ طرزِ عمل ضروری تھا۔ تاہم ہر روز نہیں ہوتا تھا۔ البتہ عوام کا اژدہام روزانہ ہوتا تھا وہ بادشاہ کے حضور میں اپنے حالات بیان کرتے، شکایتیں پیش کرتے اور جلد ہی اپنی مراد کو پہنچ جاتے۔

سوا نو بجے صبح بادشاہ دیوانِ عام میں آتا۔ جہاں چالیس ستونوں کے شہ نشین میں سنگ مرمر کے تخت پر جا کر بیٹھ جاتا اور کاروبارِ سلطنت کے انجام دینے میں مصروف ہو جاتا۔ دو سو ایک فٹ لمبے اور ستائیس فٹ چوڑے دیوان عام میں اراکین دربار دست بستہ کھڑے ہوتے، سب سے پہلے وزیر خزانہ جسے میر بخشی کہا جاتا تھا فوجی سپہ سالاروں اور حکومت کے امیروں کی درخواستیں پیش کر کے ہتھیار، خوراک، قلعوں کی مرمت اور سپاہیوں کی تنخواہوں کی منظوری حاصل کرتا۔ ملک کے ہر صوبے کے الگ الگ اخراجات کا تخمینہ پیش کرتا۔ بہادر سپاہیوں اور افسروں کے کارہائے نمایاں پر انھیں ترقی دینے اور خلعتِ فاخرہ عطا کرنے کے احکامات حاصل کرتا۔

میر بخشی کے فارغ ہونے کے بعد ملک کے مختلف صوبوں کے امراء اور حکام بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور اپنے صوبوں کے حالات بیان کرتے۔ اس کے بعد میر آتشی کی باری آتی، پھر توپ خانے کا مہتمم اور

محفوظ فوج کا سربراہ جسے میر احدی کہتے تھے پیش ہو کر اپنے محکمے کے اخراجات کی منظوری حاصل کرتا۔ اور محکمے میں کام کرنے والے افراد کے لیے جو اپنے فرائض کے انجام دینے میں نہایت دیانت دار اور مخلص ہوتے۔ جس کسی سے محکمانہ کارگزاری نہایت عمدہ ثابت ہوتی اس کے لیے اعلیٰ قدر انعامات و عطایات کے احکام صادر کرواتے۔ ان لوگوں کو نہایت قیمتی زیور، اعلےٰ نسل کے گھوڑے اور ہتھیار انعام میں ملتے، جو اس کے مستحق ٹھہرتے۔

اس کے بعد شہنشاہ کی ذاتی زمین اور جائیداد کے نگران کی باری آتی وہ شہنشاہ کے گھر کے لوگوں رشتے داروں ملازموں اور متوسلوں کے بارے میں احکام حاصل کرتا۔ میر ساماں روزانہ کی آمدنی اور میر بیوتات روزانہ کے خرچ کی منظوری لیتا، پھر اس کے خاص خاص اور معتمد امراء آگے بڑھتے، ہر صوبے کے گورنروں، سپہ سالاروں شہزادوں اور محکمہ مال کے سربراہوں کی وہ عرضداشتیں پیش کرتے جنہیں ڈاکیئے گذشتہ رات سے صبح تک لے کر آتے۔ شہنشاہ ان عرضداشتوں کا خود مطالعہ نہیں کرتے تھے بلکہ خلاصہ کلام سن کر جواب میں ارشاد کرتے۔

اس کے بعد میر صدر پیش ہوتے جو ہندوستان کے تمام قاضیوں مفتیوں، اور عالموں کے سربراہ کہلاتے تھے۔ وہ ہر صوبے کے میر صدر کی جو مرکزی میر صدر کے ماتحت ہوتے تھے۔ شہنشاہ کی خدمت میں ارسال کردہ رپورٹیں پیش کرتے۔ جن علماء، مشائخ، سادات اور عباد کی گذر اوقات کے لیے ماہانہ منظور کروانا ہوتا ان کے ناموں کی فہرست پیش کی جاتی۔ اس کے ساتھ ہی جاگیر اور منصب دینے کے احکام تصدیق ہونے کے لیے پھر سامنے لائے جاتے۔ انہی کے ساتھ

علماء و مشائخ کو مدد معاش دینے، مالگزاری معاف کرنے اور زمین دینے کے احکامات صادر ہوتے۔

یہ داروغہ عرض مکرر کا فرض منصبی قرار دیا گیا کہ وہ داد و دہش، خیرات و صدقات کے معاملات کے بارے میں شہنشاہ کو بار بار توجہ دلاتا رہے۔ اس سے پہلے کہ شہنشاہ دیوان عام کے اجلاس کو ختم کریں۔ جنگی ہاتھیوں، گھوڑوں اور شاہی ڈاکیوں کی سانڈنیوں کے راتب کا حساب پیش کر دیا جاتا اور کبھی کبھی ان جانوروں کو شہنشاہ کے معائنے کے لیے سامنے بھی لایا جاتا تھا۔

گیارہ بجے صبح شہنشاہ دیوان عام سے اٹھ کر دیوان خاص میں چلے جاتے جہاں محرمانِ راز کے سوا کسی کو پر مارنے کی مجال نہ تھی۔ وہاں سب سے پہلے سلطنت کے مختلف شعبوں اور حاکموں کے بارے میں پرچہ نویسوں (سی آئی ڈی والوں) کی خفیہ رپورٹیں پیش ہوتیں۔ پھر گورنروں کے نام فرمان شاہی ارشاد ہوتے۔ جب ان ارشادات کا مسودہ تیار ہو جاتا تو ملاحظہ کے لیے پیش ہوتا۔ اگر اس میں کسی ترمیم اور اضافے یا اصلاح کی ضرورت ہوتی تو شہنشاہ خود اپنے قلم سے لکھ کر اُسے امیر الامراء کے سپرد کر دیتے۔

امیر الامراء فرمان شاہی کو خطاط کے حوالے کر دیتا۔ وہ اسے مرصع زبان میں قرطاس پر لکھ کر امیر الامراء کو واپس کر دیتا۔ اور وہ اسے پھر نظر ثانی کے لیے شہنشاہ کی خدمت میں پیش کرتا۔ اکثر و بیشتر اوقات ایسا بھی ہوتا کہ مہر شاہی کے سوا شہنشاہ اسی قرطاس پر اپنے قلم سے بھی چند سطریں تحریر کر دیتے۔

جب دوپہر ہو جاتی تو شہنشاہ دیوان خاص کا اجلاس برخاست کر کے

حرم میں چلے جاتے وہاں کھانا کھاتے پھر تھوڑی دیر کے لیئے آرام کرتے۔ اس کے بعد ظہر کی نماز ادا کرنے کے لیے اپنی خلوت گاہ میں چلے جاتے۔ خلوت گاہ میں شہنشاہ کا زیادہ تر وقت قرآن مجید لکھنے میں گزرتا۔ کچھ وقت فقہ کی کتابوں اور بزرگان دین کی سوانحعمریوں کے پڑھنے اور ان کے ملفوظات کا مطالعہ کرنے میں بھی صرف کرتے۔ اسی اثنا میں خاص امراء کے ذریعے جو شکایات شہنشاہ تک پہنچتی تھیں۔ ان کی سماعت کر کے پھر حرم میں چلے جاتے۔ اس دوران پھر وہاں خاص کر عورتوں، یتیموں اور بیواؤں کی درخواستوں پر غور کیا جاتا، اور ان کی مالی امداد کے لیے خیرات اور عطیات کا حکم دیا جاتا۔ اتنے میں عصر کی نماز کا وقت آجاتا۔ نماز کی ادائیگی کے بعد عصر سے مغرب تک شاہی قلعے کے محافظوں کا معائنہ کیا جاتا اور سرکاری کاغذات دیکھے جاتے، پھر جب مغرب کی نماز کا وقت آتا تو قلعے کے چھوٹے بڑے تمام ملازموں کے شانہ بشانہ کھڑے ہو کر نماز کا فرض ادا کرتے، سنت اور نفل ادا کرنے کے بعد تھوڑی دیر تک چند خاص وظیفوں کا ورد کرتے۔ اتنے میں کافوری شمعیں دیوان خاص میں ہر طرف روشن ہونے لگتیں۔ شہنشاہ اپنے ہاتھ میں تسبیح لیے سیدھے ادھر چلے آتے۔ اور عشا تک محکمہ مال، محکمہ عدل اور فوج کے معاملات کے بارے میں عرضداشتوں پر غور کرتے اور فیصلہ فرماتے۔

جب عشاء کی اذان ہو جاتی تو دیوان خاص سے اٹھ کر مسجد چلے جاتے، نماز سے فراغت کے بعد کھانا کھاتے اور آرام کرتے۔ جب نصف شب گزر جاتی تو نماز تہجد ادا کرتے اور اپنی خوابگاہ خاص میں رب العزت کے سامنے روتے اور گڑگڑاتے رہتے تھے

اورنگ زیب تاریخ کے آئینے میں

ہمارے بزرگ شجاعت علی صدیقی مرحوم ملٹری اکاؤنٹنٹ جنرل پاکستان اپنے ایک مضمون میں اورنگ زیب عالمگیر کے کردار پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اورنگ زیب کے دامن پر خون کے کچھ دھبے ہیں اس نے باپ کے تخت تک پہنچنے کے لیے اپنے بھائیوں سے لڑائی کی۔ اور ان میں سے دو کو قتل بھی کیا۔ بلاشبہ اس نے اپنے باپ کو نظر بند کیا۔ مگر یہ ساری روئداد صرف اس وقت قابلِ اعتراض ہو سکتی تھی۔ جب اورنگ زیب بادشاہ بننے کے بعد ذاتی تعیّش پسند کر لینا اور عوام کو نظرانداز کر کے جبر و زیادتی کو شعار بنا لیتا۔

اگر اورنگ زیب کی زندگی اور اس کی جدوجہد کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اورنگ زیب بھائیوں سے لڑا تو محض اس لیے کہ ہندوستان میں اسلام کو زندہ کرے۔ اور عوامی فلاح و بہبود کے اس آئین و دستور کو عملی جامہ پہنائے جو اسلام نے تجویز کیا تھا۔ ہمارے خیال میں اس لحاظ سے اورنگزیب ہندوستان کے مسلمانوں کا سب سے بڑا محسن ہے۔ کہ اس نے اسلام کو متعارف کرانے اور اسلامی آئین کو بروئے کار لانے کے لیے اپنی زندگی خطرات میں ڈال دی۔

جس وقت اس کے باپ کی بیماری اور پھر موت کی خبریں پے در پے دکن آئیں۔ اور وہ زیادہ سے زیادہ تیس ہزار آدمیوں کے ساتھ برہان پور سے نکلا۔ کہ رستہ میں مراد اور شجاع سے مل کر آگرہ پہنچے، اور دارا سے مقابلہ کرے۔ اس وقت اس میں اور مراد میں جو خط و کتابت ہوئی اس سے ایک ہی بات ظاہر ہوتی ہے کہ وہ دارا سے اس لیے لڑنے کے لیے چلا تھا کہ دارا ملحد تھا۔ اور اُسے ڈر تھا کہ اگر اس ملحد کے ہاتھ میں سلطنت چلی گئی۔ تو یہ مسلمانوں کے لیے مرنے کا مقام ہوگا۔

اورنگ زیب اور مراد میں جو خط و کتابت اس موضوع پر ہوئی۔ وہ رقعات عالمگیری میں موجود ہے۔ وہ بار بار دارا کو ملحد کہتا ہے۔ اور اس سے مراد کو ڈراتا ہے۔ یہ ایک امر واقعہ ہے۔ اس دور کے مؤرخین خافی خان، عاقل خاں رازی اور صاحب عالمگیر نامہ نے اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے۔ مثلاً خافی خاں کہتا ہے:۔

"اس نے ملحد صوفیوں کی تقلید میں تصوف کو بدنام کیا اور کفر و اسلام کو ایک کر دیا تھا۔ اس نے اس باب میں کئی رسالے بڑی آب و تاب کے ساتھ شائع کیے اور برہمنوں اور ہندو فقیروں کے ساتھ دوستی بڑھائی۔"

صاحب عالمگیر نامہ نے اس میں اضافہ کیا ہے۔ اس نے پنڈتوں اور عیسائیوں کی صحبت اختیار کر لی تھی۔ اس نے وید کا ترجمہ کیا تھا۔ اور اسے صحیفۂ الٰہی سمجھتا تھا۔ اس نے اپنی انگوٹھی پر پربھو کے سنسکرت حروف کھدوائے تھے اور نماز روزہ اور دوسرے ارکانِ اسلام کو خیرباد کہہ دیا تھا۔

کہا جا سکتا ہے کہ صاحب عالمگیر نامہ کی تحریر تعصب پر مبنی تھی۔ لیکن اورنگزیب

اور شجاع کے جو خطوط رقعات عالمگیری میں چھاپے گئے ہیں۔ ان میں دارا کو ملحد کے سوا کسی اور لقب سے یاد نہیں کیا گیا۔ مثلاً شجاع اورنگ زیب کو لکھتا ہے :

بہ موجب عہد پیمان فی مابین لعزم قلع قمع ان ملحد بے دین۔

ایک دوسری جگہ بھی اسے ملحد ہی سے خطاب کیا گیا ہے :

بہ موجب قرارداد اوّل کسے کہ بہ ملحد برہم زدہ۔

یہاں بھی ملحد سے مراد دارا ہے۔ تیسری جگہ بھی ملحد سے مراد دارا ہے۔ مثلاً

فتح یافتن بر ملحد،

دور حویلی ملحد فرد د آمدند۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اورنگ زیب نے دارا کے خلاف جو لڑائی شروع کی۔ وہ اس لیے شروع کی تھی۔ کہ اورنگ زیب کے نزدیک دارا ملحد تھا اور اگر اس کی حکومت قائم ہو جاتی تو ہندوستان سے اسلام رخصت ہو جاتا۔

اورنگ زیب کے یہ خدشات غلط نہ تھے۔ دارا اکبر سے کہیں بڑا تھا۔ اور اگر اورنگ زیب اس کے مقابلے میں نہ آتا۔ تو دارا کا پروگرام قطعاً یہ تھا کہ ہندوستان میں مغل حکومت ایک سیکولر اسٹیٹ بن جاتی۔ اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے عقائد پر مشتمل ایک ایسا نیا دین مرتب ہوتا جو ان دونوں قوتوں کو ایک بنا دیتا۔

ہمارے نزدیک اورنگ زیب نے دارا سے جو لڑائی لڑی وہ شخص واحد کی لڑائی نہ تھی۔ وہ اس جماعت کی لڑائی تھی جو اسلام کو دین حق سمجھتی تھی اور اسے رائج اور نافذ کرنے کی آرزومند تھی۔ یہ اس گروہ کی لڑائی تھی جسے اکبر نے ناکام رکھا۔ اور جس نے اورنگ زیب کا سہارا لے کر دارا سے اکبر کا انتقام لینا چاہا تھا۔

اورنگ زیب بڑا سعید نوجوان تھا۔ اگر دارا اور اس کی لڑائی میں شاہجہان غیر جانبدار رہتا، تو باپ بیٹے میں کبھی وہ تلخی پیدا نہ ہوتی جو باپ کی نظر بندی پر منتج ہوئی۔ باپ سے اسے جو گہرا تعلق تھا وہ رقعات عالمگیری کے ان خطوط سے واضح ہوتا ہے جو اورنگ زیب نے باپ کے نام لکھے تھے۔

بہرحال دارا اور شاہجہان سے اورنگ زیب کی لڑائی ذاتی نہ تھی۔ یہ عقیدہ کی لڑائی تھی۔ اور اورنگ زیب کے عقیدہ کی رُو سے دارا قطعاً اس قابل نہ تھا کہ اس کے باپ کے تخت پر بیٹھتا۔ اور اس نے جان جوکھوں میں ڈال کر ایک کمزور فریق ہوتے ہوئے بھی دکن سے آگرہ پر چڑھائی کی۔ تو محض اس لیے کی تھی کہ دارا کے سر سے تاج چھین لے، اور اسے اپنے سر پر رکھ کر ہندوستان میں ایک ایسی حکومت کی بنیاد رکھے جو خالص اسلامی حکومت ہو۔

وہ بڑا عابد اور مخلص بادشاہ تھا۔ اُس کے زمانے کا سیّاح برنیئر اس کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

"اورنگ زیب کی حکومت کے پانچویں سال جب وہ پایۂ تخت دہلی پہنچا تو یہ جون کا مہینہ تھا، اور سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ اورنگ زیب نے اس گرمی میں رمضان کے پورے روزے رکھے۔ وہ روزے سے ہونے کے باوجود حکومت کے سارے کام کرتا۔ شام ہوتی تو زاہدوں کے ساتھ مل کر روزہ افطار کرتا۔ افطار میں جو اور مکئی کی روٹی کھاتا۔ اور پھر تراویح پڑھتا۔ اور رات کا زیادہ تر حصّہ عبادت میں گزارتا۔

سیّاح برنیئر کا بیان ہے۔ کہ اس بادشاہ نے رمضان کے پورے

روزے رکھے۔ رات بھر عبادت کی۔ اور روزہ جو اور مکئی کی روٹی سے افطار کیا۔ اور پھر ایسا بیمار پڑا کہ جان کے لالے پڑ گئے۔ خدا نے اسے اس خطرناک بیماری سے صحت دی۔ مگر اس نے اپنا چلن نہ بدلا۔"

صاحبِ مآثرِ عالمگیری نے بادشاہ کے کردار پر بہت مختصر مگر جامع گفتگو کی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

"بادشاہ غازی۔ مراتبِ دین کا بہت لحاظ رکھتا۔ وہ اسلام کے ارکان پر سختی سے کاربند تھا۔ اکثر وضو سے رہتا۔ کلمہ طیبہ اور دوسرے اذکار ہر وقت اس کی زبان پر رہتے۔ فرض نماز اوّل وقت میں پڑھتا۔ نماز عمداً مسجد میں جماعت کے ساتھ ادا کرتا۔ ہفتہ میں تین دن لازمی طور پر روزے رکھتا۔ اور رمضان کے روزے کو تو قضا کرنا جانتا ہی نہ تھا۔ تہجد بھی بڑی پابندی سے پڑھتا۔ اور کوئی ایسا فعل نہ کرتا جو شریعت کے خلاف ہو۔ اس نے کبھی ذاتی انتقام کے لیے کسی شخص کے خون سے ہاتھ نہیں رنگے۔ نہ کسی پر ذاتی غصّہ ظاہر کیا۔ اور نہ ذاتی استیلا کی خاطر رعیت کو کسی قسم کا نقصان پہنچایا۔ اس نے کبھی کوئی ریشمی لباس نہیں پہنا۔ اور نہ سونے چاندی کو استعمال میں لایا۔ عموماً اس کے جسم پر بہت معمولی لباس ہوتا۔ جس میں پیوند لگے ہوتے۔ وہ روزانہ دو اور کبھی تین دفعہ عوامی اجلاس کرتا۔ اس کی رعایا کے ہر فرد کو اس اجلاس میں شرکت کی اجازت تھی۔ اور ہر ایک کو حق تھا کہ اس کی ذات یا اس کے بڑے سے بڑے حاکم کے خلاف استغاثہ پیش کرے۔

کسی حاکم کو اجازت نہ تھی کہ کسی بھی شاکی کو شکایت کرنے سے روکے۔ وہ شکایتیں نہ صرف سنتا، عدل و انصاف کے تقاضوں کو پورا کرتا۔ اور مظلوم کو اس کا حق دلواتا۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوا کہ بعض عوام نے تلخ کلامی سے کام لیا اور اسے سخت سے سخت الفاظ کہے۔ اور اگر کسی پہرہ دار نے شاکی کو ٹوکا۔ تو اس نے کہا "ایسی باتیں سننے سے نفس کی اصلاح ہوتی ہے"

ماثر عالمگیری کے مصنف کا دعویٰ ہے کہ:۔

"عالمگیر نے اپنی بادشاہت کے زمانہ میں جو مغل بادشاہوں کی تاریخ میں طویل ترین زمانہ ہے۔ ایک حکم بھی غیر شرعی نہیں دیا۔ وہ فقہاء کے مشورہ اور اپنے شرعی علم کے بغیر قطعاً کوئی کام نہ کرتا۔ اس کا کوئی فعل ایسا نہ تھا جس سے ملت کے مجموعی مفاد کو نقصان پہنچتا۔ اس نے عمومی مقصد کے مقابلہ میں اپنی ذات اور اپنا نفس قطعاً مار لیا تھا"

اس نے پوری قلمرو کے ایک منصبدار، حاکم اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ مقدم تک کو یہ مستقل حکم دے رکھا تھا۔ کہ شریعت کے خلاف کوئی فیصلہ نہ کریں۔ اور نہ کوئی ایسا کام کریں جسے شریعت غیر مباح ٹھہراتی ہو۔

خدا اس کی روح کو ہزار ہزار سکون عطا فرمائے۔ اپنی رعایا کے غریبوں محتاجوں، اپاہجوں، لنگڑوں، لولوں اور اندھوں کے لیے ہر بڑے شہر میں محتاج خانے قائم کر دیئے تھے۔ جہاں دونوں وقت مناسب خوراک انہیں کھلائی جاتی۔ جہاں سے موزوں لباس انہیں پہنایا جاتا۔

ہر شہر، ہر قصبہ اور ہر بڑی سڑک کے مناسب فاصلوں پہ اس نے سرائیں

تعمیر کی تھیں کہ وہاں مسافر مفت رہائش رکھیں۔

اس نے جہاں کہیں بھی مساجد نہ تھیں، مساجد تعمیر کیں۔ جو مساجد مرمت کی محتاج تھیں ان کی مرمت کرائی۔ جہاں مؤذن و امام نہ تھے، وہاں مؤذن و امام ملازم رکھے۔ اورنگ زیب کے زمانہ میں ہر قصبہ اور ہر بڑے گاؤں کی مسجد کے مؤذن و امام کو سرکاری خزانہ سے تنخواہ دی جاتی تھی۔ ہر مسجد کے پہلو میں ایک ایک مدرسہ کھولا گیا تھا جہاں مسجد کے امام تعلیم دیتے اور بعض دوسرے اساتذہ بھی حسب ضرورت یہ خدمت انجام دیتے تھے۔

منشور فلاح عامہ

اورنگ زیب عالمگیر نے اپنے فرمان میں کہا :۔

”محبّت، شفقت، مہربانی اور عنایت کا مظاہرہ کرو۔ یہی اسباب پیداوار بڑھانے کا موجب ہیں۔ محبت اور شفقت سے کام لینے کے معنی یہ ہیں کہ رعایا سے متعینہ اور مقررہ لگان سے زیادہ ایک دھیلہ اور ایک پیسہ بھی وصول نہ کیا جائے۔ ہر علاقہ کا حامل اپنے ہاں کی رعایا کے جملہ حقوق کا محافظ اور نگران ہونا چاہیئے۔“

پھر محمد ہاشم طلب کئے گئے۔

”ہر سال کے شروع میں تم پر لازم ہے کہ تم اپنی رعایا سے متعلق ہر ممکن اطلاع مہیا کرو۔ یہ جانو کہ ان میں سے کون لوگ زراعت میں مشغول و مصروف ہیں، اور کون توجہ سے کام نہیں لیتے۔ اگر انھیں کسی مدد کی ضرورت ہو۔ وہ تمہاری توجہ و شفقت کے محتاج ہوں۔

تو ان پر توجہ کرو۔ انھیں مدد دو۔ اور آئندہ مدد کے وعدے کرو۔ اگر تم یہ جانو کہ وہ مناسب بارش اور باقی سہولتوں کے باوجود زراعت میں دلچسپی نہیں لیتے اور کھیت ویران کر دیئے ہیں تو انھیں ان کے تغافل پر تنبیہہ کرو اور ہر ممکن طریق سے انھیں اس کام میں مصروف کرو۔ اگر یہ دیکھو کہ کاشتکار محنتی بھی ہیں اور کام بھی کرنا چاہتے ہیں۔ مگر ان کے پاس کھیتی باڑی کے لیے سرمایہ نہیں ہے تو انھیں سرکاری خزانہ سے تقاوی دو۔ یہ اس لیے کہا گیا کہ ملک کی پیداوار بڑھے اور ملک خوشحال ہو۔

آگے چل کر اورنگ زیب نے اپنے اس عامل کو لکھا:۔

جہاں زمین بے آباد پڑی ہو اور اس کا کوئی مالک یا دعویدار نہ ہو۔ وہاں تم اپنی مرضی استعمال کرو اور زمین ایسے لوگوں کو دو جو اسے اچھی طرح کاشت کر سکیں۔ اور لگان اتنا مقرر کرو جسے وہ خوشی اور آسانی سے ادا کر سکیں اور جو شریعت کے قانون کے تابع ہو۔

اس فرمان میں یہ تاکید بھی کی گئی کہ:

جن علاقوں میں لگان نقد کی صورت میں متعین ہے۔ اگر وہاں کے کاشتکار جنس کی صورت میں لگان دینا پسند کریں تو تمہیں یہ سہولت ضرور بہم پہنچانی چاہیئے۔

اورنگ زیب کو اپنی رعایا کا اس قدر خیال تھا۔ کہ اس نے صراحت کی کہ اگر زمین کا کوئی ٹکڑا کسی معقول وجہ سے کاشت نہ کیا جا سکا ہو تو اس سال اس کا لگان وصول نہ کیا جائے۔ وصولی صرف مزروعہ زمین اور پیداوار پہ ہو۔ اور اس

وقت ہو جب فصل کٹ کر غلہ کی صورت اختیار کرے۔

ایسی تمام زمینیں جو نیک کاموں کے لیے وقف کی گئی تھیں یا وقف کی جائیں، ان کے متعلق اورنگ زیب اپنے اس فرمان میں کہتا ہے:

اگر کوئی آدمی اپنی زمین رفاہِ عام کے کسی کام، کسی سرائے، کسی خانقاہ یا کسی عبادت خانہ کے ساتھ مخصوص کر دیتا ہے تو اسے مالگذاری سے معافی دے دو۔ تاکہ رفاہِ عامہ کے کام میں رکاوٹ نہ ہو۔

اورنگ زیب کاشتکاروں اور مزارعین کے کام اور زرعی ترقی میں جس قدر دلچسپی لیتا۔ اس کا علم اس فرمان سے بھی ہوتا ہے جو اس نیک دل بادشاہ نے راسک داس کروڑی کے نام روانہ کیا تھا۔ اس کے پہلے الفاظ ہیں:۔

تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ بادشاہ کی سب سے بڑی خواہش اور آرزو یہ ہے کہ زراعت ترقی کرے۔ اس ملک کی زرعی پیداوار بڑھے۔ کاشتکار خوشحال ہوں۔

اس کے بعد شاہی فرمان شروع ہوتا ہے۔

بادشاہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم اپنے ماتحت دیوانوں اور امینوں کے ذریعہ اپنے علاقہ کی زمین کی پوری کیفیت معلوم کرو۔ یہ جانو کہ کتنی مزروعہ زمین زیر کاشت آ جائے۔ یہ زمین جن لوگوں کو دو۔ ان سے مضبوط قول و اقرار کر دا اور آئندہ اچھے مستقبل کی امیدیں دلاؤ اور انہیں پورا کرو۔ جہاں متروکہ اور غیر مستعملہ کنویں پاؤ ان کی اپنے خرچے سے مرمت کراؤ۔ اور جہاں نئے کنوؤں کی ضرورت ہے وہاں نئے کنویں کھدواؤ۔ اور کچھ

ایسا انتظام کرو کہ رعایا یا کاشتکار ان سے پورا فائدہ اٹھا سکیں۔ اور انھیں اتنی پیداوار نصیب ہو کہ اپنا خرچ بھی نکالیں اور حکومت کا لگان بھی آسانی سے ادا کر سکیں۔ یاد رکھو اصل مقصود رعایا کی خوشحالی اور فلاح ہے۔

اس فرمان میں اس سے یہ بھی کہا گیا تھا کہ۔

وہ ہر گاؤں، ہر پرگنہ کی مزروعہ، غیر مزروعہ، آباد اور غیر آباد زمین کی مفصّل روئداد مرتب کرے۔ کھیتوں کی نسبتاً قوتِ پیداوار کا جائزہ بھی لے۔ کاشتکاروں کے نام بھی تحریر کریں۔ نیز ان دیہات یا کھیتوں کی تفصیل بھی لکھے جو سال ہا سال سے ویران پڑے ہیں۔ اور وہ تجاویز بھی بتائیے جن سے انہیں آباد کیا جا سکتا ہے۔

سب سے بڑی چیز جس کیطرف اس فرمان میں اشارہ کیا گیا ہے وہ یہ تھی۔

کسی سرکاری عامل یا کسی چوہدری کو خلوت میں باریاب نہ کرو۔ اور نہ ان سے علیحدگی میں کچھ کہو۔ سب کو کھلی مجلس میں بلاؤ اور ان سے میانہ روی سے گفتگو کرو۔ خود کو رعایا سے براہِ راست متعارف کراؤ غریبوں کو مواقع دو۔ کہ وہ براہِ راست تمہارے پاس آئیں اور اپنی حالت تم سے بیان کریں۔ اس سے یہ فائدہ ہو گا کہ ان بیچاروں کو اپنی شکایات کے ازالہ کے لیے کوئی اور وسیلہ تلاش نہ کرنا پڑے گا۔

امینوں کو حکم دو کہ وہ ہر سال شروع کے دنوں میں گاؤں گاؤں جائیں اور وہاں کے ایک ایک کاشتکار اور کسان کی کیفیت اور حالت سے واقف ہوں۔ اور مزروعہ اور غیر مزروعہ کھیتوں کا جائزہ لیں۔ امینوں

کو چاہیے کہ وہ کاشتکاروں میں کاشت کو بڑھانے کے ولولے پیدا کریں۔ ان کے حوصلے بڑھائیں۔ جن کھیتوں میں اچھی پیداوار نہیں ہوتی انکی قوت پیداوار بڑھانے کے لیے دوسرے ذرائع استعمال کریں۔ اگر کہیں کاشتکار بددل ہو کر کھیت چھوڑ گئے ہوں تو ان کو واپس لائیں ان کے اطمینان کے سامان پیدا کریں اور ان کے دل بڑھائیں۔

کوشش کرو کہ بنجر علاقے اور زراعت کے ناقابل زمینیں پھر سے کاشت ہو سکیں۔ اپنے امینوں کو یہ بھی حکم دو کہ وہ گاؤں گاؤں پھر کر ایک ایک کھیت کی پیداوار کا صحیح تخمینہ مرتب کریں۔ اور پھر اتنا مالیہ تشخیص کریں جس سے حکومت کو بھی نقصان نہ پہنچے، اور رعایا بھی خوشحال اور مطمئن ہو۔

تم خود جب دورہ پر جاؤ تو گاؤں گاؤں پھرو۔ کھیت کھیت کا محاسبہ کرو۔ ایک ایک کاشتکار سے ملو۔ اور اس کی شکائتیں سنو۔ ان کی صحیح حالت کا جائزہ لو اور دیکھو کہ کہیں ان کے ساتھ بے انصافی اور زیادتی تو نہیں۔ مالیہ ان کی پیداوار اور استطاعت سے زیادہ تو نہیں۔

یاد رکھو عدل و انصاف اور رعایا کی خوشحالی ہمارا مقصود اول ہے۔ اگر کہیں انکے کھیت ظالموں اور جابروں نے حق کے بغیر دبا رکھے ہیں۔ تو ان سے یہ کھیت واپس لے کر مستحقین کو دلوا دو۔

اگر خدانخواستہ کوئی آسمانی یا زمینی بلا کھیتوں پر نازل ہو جائے

تو امینوں سے کہو کہ ہر کھیت کا خود معائنہ کریں اور نقصان کی صحیح کیفیت ضبطِ تحریر میں لے آئیں۔

امینوں، مقدموں اور قانون گوؤں کے ایسے بیانات قطعاً قبول نہ کرو جن سے رعایا سے بے انصافی کا احتمال ہو۔

اس بات کی پابندی بھی تم پر لازم ہے کہ کہیں کوئی امین غیر شرعی محصول وصول نہ کرنے پائے۔ ہر چودھری اور ہر قانون گو سے ضمانت لو کہ ممنوع محصول وصول نہیں کریں گے۔ اگر تمہیں کبھی پتہ چلے کہ کسی عامل نے کہیں کوئی ممنوع یا غیر شرح محصول وصول کیا ہے تو بادشاہ کو اسی وقت مطلع کرو۔ تاکہ اس فرض ناشناس کو عبرتناک سزا دی جاسکے۔

ایماندار، مستعد اور نیکوکار عاملوں کی کارگزاری اور ناموں سے ہمیں اطلاع دو۔ تاکہ انہیں نوازا جائے۔ فرض ناشناس اور غیر مستعد کارکنوں کی بھی ہمیں خبر ہونی چاہیے تاکہ انہیں سزا دی جاسکے۔

مرأتِ احمدی، خافی خاں، سہٹوریا، عالمگیری ہیں اورنگ زیب کے کئی اور ایسے فرمان بھی درج ہیں جو اس اچھے بادشاہ نے کاشتکاروں اور دوسری رعایا کی فلاح و بہبود کے متعلق وقتاً فوقتاً تحریر فرمائے تھے۔

یہ امر واقعہ ہے اور کوئی مؤرخ حتیٰ کہ سر جادو ناتھ سرکار بھی اس بات سے اختلاف نہیں کرسکے۔ کہ اورنگ زیب نے عوامی فلاح و بہبود کے لیے بہت کام کئے، اور ایک ایسے ضابطہ و نظام کار کو متعارف کرایا۔ جو خالص اسلامی تھا۔

اگر اسے مرہٹوں سے نپٹنا نہ پڑتا اور اس کی قیمتی زندگی کے ۲۵ سال اس

لمبی لڑائی کی نذر ہو جاتے جو اس نے دکن میں مرہٹوں کے خلاف لڑی۔ تو اس کا عہد حکومت تاریخِ عالم میں مثالی دور ہوتا۔ اس لمبی لڑائی کے باوجود بھی اورنگ زیب کا یہ ایک مثالی کارنامہ ہے۔ اس نے لڑائی کے اخراجات کے لیے عوام پر کوئی نیا ٹیکس نہیں لگایا۔ اور نہ ان اسی محصولوں میں سے ہی کوئی محصول دوبارہ لگایا جنہیں وہ شروع میں معاف کر چکا تھا۔

کچھ لوگوں نے اورنگ زیب کی دکن کی لڑائیوں پر بڑی حرف گیری کی ہے۔ اور انہیں رفاہِ عامہ کے عمومی مقاصد کے منافی قرار دیا ہے۔ یہ حرف گیری محض اس لئے ممکن ہوئی کہ اس کے وارث قطعاً نا اہل تھے۔ اگر وہ اہل ثابت ہوتے تو اورنگزیب نے دکن میں مرہٹوں کو ختم کر کے جو سیاسی اور مجلسی سہولتیں ان کے لیے بہم پہنچائی تھیں۔ وہ غیر فانی عوامی فوائد کا موجب ہوتیں۔

حقیقت دیکھی جائے تو دکن میں اورنگ زیب نے جس حکمتِ عملی پر عمل کیا۔ وہ دور رس نتائج کی حامل تھی۔ اورنگ زیب چاہتا تھا دکن کے ظالم و جابر اور لٹیرے مرہٹوں اور ان کو پناہ دینے والوں کی قوت و طاقت ختم کر کے اس سمت کے عوام کو اس نظامِ حیات سے متعارف کرائے جو اس کے نزدیک دنیا کا بہترین نظام حیات تھا۔

بعض ہندو اور انگریز مؤرخین نے اس پر تعصب کا طعن کیا اور مرہٹوں کے استیصال کو مذہبی دیوانگی یا جنون سے تعبیر کیا ہے۔ در اصل یہ نہ مذہبی جنون تھا نہ تعصب۔ یہ دکن کے عوام کی اصلاح کی ایک تدبیر اس بوڑھے مسلمان تاجدار نے کی۔ ورنہ تاریخ خوب جانتی ہے کہ سیوا جی، اس کے ورثا، اور اس کے ہم پیشہ مرہٹے سردار

لوٹ مار کو بہت شریفانہ کاروبار سمجھتے تھے۔ اور نہ صرف ہمسائے ان کی وجہ سے بہت تنگ تھے۔ ان کی رعایا بھی ان سے بہت نالاں تھی۔ اورنگ زیب نے ان کی قوت و طاقت پر بھرپور وار کر کے انہیں ان کے پنجۂ ظلم سے نکالنا چاہا تھا۔

اس طرح اورنگ زیب کی یہ لمبی لڑائی مذہبی لڑائی نہ تھی۔ ایک مجلسی اور اصلاحی جدوجہد تھی۔ اور اس جدوجہد کا تماشا جن لوگوں نے کیا ہے۔ وہ ہی جانتے ہیں، کہ اس بوڑھے نے اس جدوجہد میں کیسی کیسی تکلیفیں اٹھائیں۔ وہ کن پہاڑوں پر چڑھا، کن گھاٹیوں میں سے گزرا۔ اور کیسے کیسے نازک مراحل اسے پیش آئے۔

وہ تاریخ کا سب سے زیادہ صابر، سب سے زیادہ محنتی اور سب سے بڑا سپہ سالار ہے۔ وہ نوے برس کی عمر میں بارہ بارہ گھنٹے متواتر گھوڑے کی پیٹھ پر سوار رہتا، بلاشبہ اس غیر معمولی محنت و مشقت نے اس بوڑھے کے قویٰ بُری طرح مضمحل کر دیئے تھے اور جب وہ ۱۱۱۸ھ میں احمد نگر میں ٹھہرا تھا۔ تو اس میں اتنی سکت نہ تھی کہ کوئی اور بڑی مہم سر کر سکتا۔

وہ بہت معمولی سا بیمار ہوا۔ اور اسی احمد نگر میں جسے احمد شاہ گجراتی نے آباد کیا تھا کئی دن بیمار رہ کر اس دنیا سے رخصت ہوا۔

مرنے سے چند لمحے پہلے اس مسلمان بادشاہ نے اپنے ورثا کے لیے جو وصیت لکھی تھی، اس میں حکم دیا تھا۔ میری تجہیز و تکفین میں کوئی غیر شرعی طریقہ استعمال میں نہ لایا جائے۔ اور میری قبر کچی بنے۔

ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں میں یوں تو علاؤ الدین خلجی، فیروز شاہ تغلق اور شیر شاہ سوری نے عوامی فلاح و بہبود کے بہت کام کئے مگر ان میں کوئی ایسا نہ تھا۔

جس نے پیوند لگا ہوا لباس اس لیے پہنا۔ کہ عوام پر اس کا بوجھ نہ پڑے۔ جس نے روکھی سوکھی جَو کی روٹی اس لیے کھائی کہ عوام کو دو وقت پیٹ بھر کر کھانا نصیب ہو۔

یہی علاقہ جس سے اس کی نعش گزری تھی اس کی آمد سے پہلے ویران تھا۔ مگر اس نے احمد نگر میں رہ کر اسے جنّت کا نمونہ بنا دیا تھا۔ اور عوام کو اس طرح خوشحال کیا تھا۔ کہ شاید ہی پہلے کسی بادشاہ نے کیا ہو:

اورنگ زیب عالمگیر

ایک خدا ترس اور انصاف پسند بادشاہ ۔ جس کے ساتھ مؤرخوں نے ناانصافی کی ہے

شاہجہان عہد مغلیہ بلکہ برصغیر پاک و ہند کے مسلم بادشاہوں میں سب سے زیادہ ذلیشان، باعظمت اور جاہ و جلال والا شہنشاہ گزرا ہے۔ اس کا عہد عہد مغلیہ کا "زریں زمانہ" تصور کیا جاتا ہے۔

شاہجہان کی ممتاز محل کے بطن سے ۱۴ اولادیں ہوئیں۔ جن میں سے سات زندہ رہیں۔ چار لڑکے اور تین لڑکیاں۔ لڑکوں میں محمد دارا شکوہ سب سے بڑا تھا۔ اس کے بعد شجاع اورنگ زیب اور مراد بالترتیب تھے۔ لڑکیوں میں جہاں آرا سب سے بڑی اس کے بعد روشن آرا اور گوہر آرا تھیں۔

محمد دارا شکوہ شاہجہان کا سب سے بڑا بیٹا ۲۵ مارچ ۱۶۱۵ء کو اجمیر میں پیدا ہوا۔ دارا نہایت ذہین اور فیاض تھا۔ وہ انتہائی علم دوست اور علم پرور تھا۔ جہاں تک اس کی علمی قابلیت کا تعلق ہے اس کا شمار اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ طبقہ اور محققین میں ہو سکتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے ماحول کے فطری رجحانات اور انفرادی صلاحیتوں کے مجموعی اثر سے اس کے نظریات قدرے مختلف ہو گئے اور وہ اپنی تصانیف میں صحیح اسلامی زاویہ نظر سے کچھ ہٹا ہوا نظر آتا ہے۔ اور یہ بات مسلم علماء کو مشتعل کرنے اور

اور عام لوگوں کو اس سے بدظن کرنے کے لیے کافی تھی۔ مذہبی خیالات کے لحاظ سے دارا اس جماعت کا صحیح نمونہ تھا جو ہندوؤں کو اپنانے کے لیے اسلامی توحید اور ویدانتک فلسفہ کو ایک سمجھتی تھی۔

شاہجہاں کو دارا بے حد عزیز تھا۔ اس وجہ سے شاہ جہاں اسے اپنے پاس سے کبھی جدا نہ کرتا تھا سوائے قندھار کی مہم کے کسی اور معرکہ میں دارا شریک نہیں ہوا تھا۔ شاہجہاں نے اسے وہ اعزاز بخشے تھے جو اس سے قبل کسی شاہزادے کو حاصل نہیں ہوئے تھے۔ اس کو دربار میں بادشاہ کے برابر طلائی کرسی پر بیٹھنے کی اجازت تھی۔ اس کا منصب ساٹھ ہزاری تھا۔ اس کے بیٹوں کے منصب شاہجہاں کے دوسرے فرزندوں کے برابر تھے اور آخر میں جب شاہجہاں علیل ہوا تو اس نے دارا کو اپنا ولی عہد بنا دیا اور نظم ونسق کے جملہ اختیارات اسے سونپ دیئے۔

شاہجہاں کا دوسرا فرزند محمد شجاع ۲۳ جون ۱۶۱۶ء کو اجمیر میں پیدا ہوا پہلے وہ دکن کا گورنر مقرر ہوا۔ اس کے بعد بنگال بھیج دیا گیا۔ جہاں ۲۰ سال تک وہ صوبہ دار رہا۔ اڑیسہ کا صوبہ بھی اس کی عملداری میں دے دیا گیا تھا۔ شجاع بنگال اور اڑیسہ کی صوبہ داری سے بہت مطمئن اور خوش تھا۔ وہ نہ مراد کی طرح بہادر اور نڈر سپاہی تھا۔ اور نہ دارا اور اورنگ زیب کی طرح فلسفی و عالم بلکہ شاہجہاں کے الفاظ میں "شجاع جز سیر چشمی وصفی ندارد" کا صحیح مصداق معلوم ہوتا ہے۔

شاہجہاں کا تیسرا فرزند محمد اورنگ زیب تھا۔ جو ۱۴ اکتوبر ۱۶۱۸ء کو ددھ کے مقام پر پیدا ہوا۔ جن اساتذہ نے اسے تعلیم دی۔ ان میں سید اسعد اللہ خاں، ملا صالح۔ محمد ہاشم گیلانی۔ مولوی عبداللطیف سلطان پوری۔ ملا محی الدین اور شیخ احمد عرف ملا جیون

بہت ممتاز ہیں ۔ اورنگ زیب کی زندگی اور اس کی سیرت پر محمد ہاشم گیلانی کی شخصیت کا بہت گہرا اثر پڑا ۔ اورنگ زیب کی طبیعت میں جس قدر نیکی اور مذہب سے رغبت تھی وہ سب آپ ہی کا فیض تھا ۔ اس نے بچپن ہی میں تفسیر حدیث اور فقہ پڑھ لی تھی ۔ اور امام غزالی کی اکثر تصانیف کا مطالعہ بھی کر لیا تھا ۔ اورنگ زیب فنون سپہ گری میں بھی ماہر تھا ۔ چودہ سال کی عمر میں اس نے مست ہاتھی سے مقابلہ کر کے دوست و دشمن سے یکساں طور پر داد شجاعت حاصل کی تھی ۔ تخت نشینی کی جگہ تک کوئی ایسا معرکہ نہ تھا جس میں اورنگ زیب نے حصہ نہ لیا ہو ۔ خواہ وہ سرکشوں کی بغاوت ہو یا بلخ بدخشاں کے معرکے ہوں ۔ قندھار کے محاصل ہوں یا دکن کی جنگیں ۔ ہر میدان میں اورنگ زیب کسی نہ کسی حیثیت سے ضرور شریک تھا ۔ بلخ بدخشاں کے معرکے میں اس کی بہادری ، جوانمردی ۔ ثابت قدمی اور استقلال کو دیکھ کر دوست دشمن دونوں کی زبان سے آفرین نکلا ۔ اور عبدالعزیز نے تسلیم کر لیا کہ ایسے جواں مرد مجاہد سے جنگ کرنا تقدیر سے جنگ کرنا ہے ۔ ان معرکوں نے اسے ایک باعزم سپاہی ، اولوالعزم جنرل اور صحیح معنوں میں مجاہد ثابت کر دیا ۔

بہر حال چاروں شاہزادوں میں اورنگ زیب کو ہر اعتبار سے اولیت اور فوقیت حاصل تھی ۔ اور وہ ان لوگوں میں ہر طرح بلند تھا ۔ شاہجہاں کا سب سے چھوٹا فرزند مراد بخش تھا جو ۲۹ اگست ۱۶۲۴ء کو دھتاس میں پیدا ہوا ۔ یہ سب سے زیادہ نڈر اور بہادر تھا ۔ لیکن ساتھ ہی سب سے زیادہ خود اعتقاد اور خود رائے تھا ۔ وہ انتہائی غیر مستقل مزاج تند خو اور جلد باز تھا ۔ مراد انتہائی سادہ لوح اور ناسمجھ تھا ۔ وہ دوستوں اور دشمنوں میں تفریق نہ کر سکتا تھا ۔ علی نقی دیوان کا قتل اس کی ایک

اہم مثال ہے ، مراد نے اس طرح نہ صرف اپنے مخلص دوست اور سچے دوست کو قتل کر دیا بلکہ اس خونِ ناحق کے باعث اس کو بھی قتل ہونا پڑا ۔

چاروں شہزادے اور اُن کے باہمی تعلقات

(اگرچہ مضمون کا عنوان "اورنگ زیب اور مراد کے باہمی تعلقات" ہے لیکن جب تک دارا اور اس کے دوسرے تین بھائیوں سے اسکے تعلقات کا تذکرہ نہ کیا جائے مضمون واضح نہیں ہو سکتا)

دارا شاہجہاں کا عزیز ترین فرزند تھا ۔ اپنی اس پوزیشن سے اس نے ناجائز فائدہ اٹھایا ۔ اس کا رویہ اپنے بھائیوں کے ساتھ بہت خراب تھا ۔ اس لئے شہزادوں میں دو گروہ بن گئے ۔ ایک جس میں دارا تنہا تھا ۔ لیکن اس کی پشت پر شاہ جہاں اور سلطنت مغلیہ کے تمام وسائل تھے ۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے بھائیوں کو ملانے کی کوشش نہیں کی ۔ بلکہ انہیں راہ کا کانٹا سمجھ کر راستہ سے ہٹانے کی کوشش کی ۔ عاقل خان لکھتا ہے :

"آں جناب (دارا) غرور و تکبر کی بنا پر جو انسان کے بدترین افعال ہیں ۔ اپنے آپ کو بنائے وراثت و استحقاق حضرت صاحب قران ثانی کی سلطنت اور وسیع حکومت ہند کا والی خیال بلکہ یقین کر کے بھائیوں کے شجر وجود کی بیخ کنی کی جو ملک اور سلطنت کے حصہ دار وارث تھے ۔ اپنی ہمت کو منحصر کر دیا اور ظاہر و پوشیدہ اس مخصوص کام کی آگ بھڑکانے لگے ۔ اس کا خاص دشمن اورنگ زیب تھا ۔ جو اپنی فطری صلاحیتوں اور دنیاوی تجربوں کیوجہ سے اس کا مدمقابل بن گیا تھا ۔ وہ صرف ملکی سیاست میں

ہی اس کا حریف نہ تھا۔ بلکہ مذہبی خیالات میں بھی دونوں میں نمایاں فرق تھا۔ دارا صوفی ہمہ اوست کا قائل اور الحاد کے قریب تھا۔ اورنگ زیب سچا مسلمان شرع کا پابند اور عالم باعمل تھا۔"

دارا کے یہی مذہبی خیالات تھے۔ جس نے اس کے بھائیوں کے ہاتھوں کو اور مضبوط کر دیا تھا اور عام مسلمانوں کی ہمدردی اس سے چھین لی تھی۔ جہاں اورنگزیب کے ساتھ براہ راست دارا کا یہی سلوک تھا۔ وہاں یہ بھی کوشش تھی کہ دوسرے بھائی اورنگ زیب سے نہ مل جائیں۔ لیکن یہ قدرتی امر تھا۔ کہ تینوں کا دشمن ایک ہی تھا۔ تو وہ کیسے ایک ساتھ نہ ہوتے۔ یہی ایک جذبہ حفاظتی تھا۔ جس نے ان تینوں بھائیوں کو باہم متحد ہونے پر مجبور کیا۔ عاقل خاں لکھتا ہے :۔

"آنحضرت (عالمگیر) دیگر شہزادگان عالی تبار اس حقیقت کو بھانپ گئے اور اپنی عزت اور جان کی حفاظت کی فکر اور انجام کی دوستی کے خیال میں منہمک ہو گئے اور اس طاقتور دشمن کی ایذا رسائی سے جو زیادتی شوکت و طاقت اور یار و مددگار کی شرکت سے مختص تھی، بے خوف نہ رہے۔ اس لیے تینوں بھائیوں میں (پہلے اورنگ زیب اور شجاع کے درمیان اور بعد میں مراد بھی اس معاہدہ میں شریک ہو گیا) ایک اتحاد ثلاثہ ہوا تاکہ دارا کے اقتدار کا خاتمہ کیا جائے۔ ورنہ بڑا بھائی بھیڑیے کی طرح خون کا پیاسا ہے۔ اور باوجود اس کے کہ حضرت صاحب قران ثانی کا وسیع سایہ دنیا والوں کے سر پر پھیلا ہوا ہے۔ لیکن ہم ان کے مکر اور ایذا رسانی سے بے خوف نہیں ہیں۔"

ستمبر ۱۶۵۷ء میں شاہجہاں اچانک بیمار ہو گیا۔ اس کی حالت اس درجہ خراب ہو گئی کہ اکثر لوگوں کو اس کی موت کا یقین ہو گیا۔ ایک طرف شاہجہاں نے دارا کو اپنا ولی عہد بنا کر تمام نظم و نسق اس کے حوالے کر دیا تھا اور دارا نے دارالسلطنت کی تمام خبروں کو باہر جانے سے روک دیا تھا۔ مراد نے صرف شبہ کی بنا پر دیوان علی نقی کو قتل کر دیا۔ (اکتوبر ۱۶۵۷ء) سورت کی بندرگاہ کو لوٹا ــــ اور آخیر میں دسمبر ۱۶۵۷ء میں احمد آباد میں اپنی بادشاہت کا اعلان کیا "مروج الدین" کا لقب اختیار کیا۔ اور اپنے نام کا سکہ چلایا۔ اور خطبہ پڑھا ــــ اپنی اس مطلق العنانی کے باوجود اس کو اپنے اوپر مکمل بھروسہ نہ تھا۔ اس نے اورنگ زیب کے پاس محمد رضا کو بھیجا۔ اور سابقہ معاہدہ اتفاق اور اتحاد کا حوالہ دیتے ہوئے آئندہ کارروائی کے متعلق دریافت کیا۔ چونکہ اورنگ زیب نے اب تک اس سلسلے میں کوئی قدم نہیں اٹھایا تھا۔ اس وجہ سے اس نے مراد کو بھی مشورہ دیا۔ کہ جلد بازی سے کام نہ لے۔ اس طرح خود مراد خاں نے اورنگ زیب کو مجبور کیا کہ وہ جلد از جلد اپنی پالیسی کا اعلان و اظہار کرے۔ ورنہ وہ سابقہ اتحاد کو پس پشت ڈال کر تنہا ہی دارا کے مقابلہ کے لیے جائے گا۔

شاہ جہاں کی علالت اور برہان پور سے روانگی کے قبل تک جو خط و کتابت اورنگ زیب اور مراد کے درمیان ہوئی اس سے جو نتائج اخذ ہوتے ہیں۔ وہ یہ ہیں:

(۱) اورنگ زیب نے مراد کو دارا کے مقابلہ کے لئے نہیں اکسایا تھا۔

(۲) مالِ غنیمت کی تقسیم کے سلسلے میں کوئی گفتگو دونوں کے درمیان نہیں ہوئی تھی اور خافی خاں کا یہ بیان کہ اورنگ زیب نے مراد کو لکھا؛

"مجھ کو کسی وجہ سے بھی کاروبار دنیا سے غداروں و ناپائیداروں کے ساتھ وابستگی نہیں ہے اور سوائے بیت اللہ کی زیارت اور طواف کے میرا کوئی ارادہ نہیں ہے" غلط ہے۔

اصل معاہدہ جو اورنگ زیب اور مراد کے درمیان ہوا۔ وہ یہ ہے جس سے خافی خاں کے بیان کی تردید ہو جاتی ہے۔

معاہدہ کہ بہ التماس بادشاہزادہ محمد مراد بخش قلمی شد

" آداب۔ برادر جان برابر۔ اس مہم میں جس کا انجام محمود سے موافقت اور تعاون اور بھائی چارگی جو عہد و پیمان کے ذریعہ مستحکم کئے گئے تھے از سر نو ایمان و الفان سے مضبوط کر گئے۔ اپنے دل میں طے کر لیا کہ اس دشمن دین و دولت کے استیصال اور امور سلطنت کے انتظام و انصرام کے بعد دوستی اور اتفاق کے مضبوط راستے کو اختیار کر کے ہر جگہ اور ہر کام میں میرے رفیق اور میرے شریک رہیں گے۔ اور ہمارے دشمن کو دشمن اور ہمارے دوست کو دوست سمجھتے ہوئے کسی حال میں بھی ہماری خوشنودی اور مرضی سے باہر نہ ہوں گے۔ تمام ملک محروسہ میں سے جو کچھ آپ کو دیا جائے گا قانع اور خوش ہو کر زیادہ طلب نہ کریں گے۔ اس لیے لکھا جاتا ہے کہ انشاء اللہ جب تک اخلاص، یک رنگی اور حق شناسی کے خلاف کوئی بات ظہور میں نہ آئے گی۔ ہماری شفقتیں اور مہربانیاں ہر روز زیادہ ہوتی جائیں گی۔ فریقین کے نفع و ضرر کو ایک سمجھ کر ہر وقت اتحاد کو بہترین صورت

میں جاری رکھیں گے۔ اور وہ عنایات جو برادر پر آج مبذول ہیں، مقصد حاصل ہو جانے کے بعد، ملحد کی شکست ہو جانے کے بعد اور زیادہ ہو جائیں گی۔ وفائے وعدہ کے طور پر جیسا کہ پہلے طے ہو چکا ہے صوبہ لاہور کابل، کشمیر، ملتان، بھکر اور ان تمام اضلاع کو جو خلیج عمان کے کنارے تک ہیں، آپ کے حق میں واگذاشت کر کے اس بارے میں کوئی مضائقہ نہیں کریں گے۔ ملحد، بدکردار کی شکست اور شر و فساد کے خاتمہ کے بعد، جس میں آپ کی شرکت ناگزیر ہے بلا توقف آپ کو اس حدود میں روانہ کر دیا جائے گا۔ میں اس وعدہ کی سچائی میں خدا اور رسولؐ کو گواہ بناتا ہوں اور اس تحریر کو اپنی مہر اور پنجہ کے نقش سے مزین کرتا ہوں۔ آپ بھی آیت کریمہ ..... عہد کو پورا کریں کہ اس کی جواب دہی ہوگی۔" کو پیش نظر رکھتے ہوئے معاہدہ کے لوازمات کی پاسداری کریں گے۔ اور کوتاہ اندیشوں، شورش پسندوں اور باطل طریقہ سے فساد برپا کرنے والوں کی باتوں کو رضامندی کے کانوں سے نہیں سنیں گے۔ اللہ ہم کو اور آپ کو اپنی مرضی اور صحیح راستہ پر چلنے کی توفیق دے۔"

جو معاہدہ اورنگ زیب اور مراد کے درمیان ہوا اس میں پہلے دونوں فریقین کے واسطے چند لازم عمل ہیں۔ اس کے بعد غنائم کی تقسیم ہے۔ آخر میں اورنگ زیب نے مراد کو متنبہ کر دیا تھا کہ وہ شر پسندوں کے بہکانے میں نہیں آئے گا۔

ایک اور بات جو معاہدہ سے ظاہر ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ معاہدہ پیش کرنے والے کی حیثیت فریق اعلیٰ کی ہے

تیسری بات جو معاہدے سے ظاہر ہوتی ہے ، وہ یہ ہے کہ فریق اعلیٰ معاہدہ کا اس وقت تک پابند رہے گا۔ جب تک دوسرا فریق معاہدہ کی مکمل پابندیاں اور فریق اعلیٰ سے اپنی وفاداری کرتا رہے گا۔ اس کے بعد دھرمات اور سامر گڑھ کے معرکے ہوئے۔ جن میں اورنگ زیب اور مراد کی متحدہ فوجوں کو کامیابی ہوئی۔ سامر گڑھ کی جنگ کے بعد دارا دہلی روانہ ہوگیا۔ دارا کی شکست کا شاہجہاں کو بے حد صدمہ تھا۔ وہ اورنگ زیب کے اقتدار کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے پہلے اورنگ زیب کے فرزند محمد سلطان کو ملانے کی کوشش کی۔ اس کے بعد اورنگ زیب کو قلعہ میں بلاکر قتل کرنے کی کوشش کی۔ جب ان تمام کوششوں میں ناکام ہوا تو مراد کو ملانے کی کوشش کی مراد کو خط لکھا کہ تم اورنگ زیب اور اس کے لڑکے کو بہانہ سے بلاکر قید کر لو۔ میں ہندوستان کی تمام سلطنت کا تم کو حاکم بنا دوں گا۔ لیکن اس کام میں نہایت ہوشیاری سے کام لینا۔ جہاں مراد کو یہ لالچ دیا۔ وہیں دارا کو جواب تک دہلی میں تھا۔ تحریر کیا کہ تم دہلی میں ٹھہرو۔ جہاں خزانہ اور فوج کی کمی نہیں ہے۔ میں مہم کو یہیں فیصل کئے دیتا ہوں۔ اتفاق سے دونوں خطوط مراد کے نام کا اور دارا کے نام کا اورنگ زیب کو مل گئے۔ وہ شاہجہاں کی چالاکی اور سازش کو سمجھ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ مراد اپنی سادہ لوحی کیوجہ سے شاہجہاں کے دام میں آسانی سے پھنس جائے گا۔ اس کا یہ شبہ غلط نہیں تھا۔ مراد نے اپنے رویہ سے اس کے شبہ کو یقین میں تبدیل کر دیا۔ اس نے اپنی فوجوں میں اضافہ کرنا شروع کر دیا اور اورنگ زیب کے سپہ سالاروں کو لالچ دے کر ملا لیا۔ اور سب سے بڑھ کر اورنگ زیب کی درخواست پر دارا کے مقابلہ کے لیے دہلی روانہ نہیں ہوا بلکہ اس کے بعد اورنگ زیب کے تعاقب میں روانہ ہوا۔

اورنگ زیب سمجھ گیا کہ یہ شاہجہاں سے اشتراکِ عمل کا نتیجہ ہے۔ لہٰذا اس نے مراد کو گرفتار کر لیا۔

اورنگ زیب کے اس عملِ گرفتاری کو سمجھنے کے لیے جنگِ تخت نشینی کی نوعیت سمجھنا اشد ضروری ہے یہ جنگ صرف تخت اور تاج کی جنگ نہ تھی بلکہ حقیقت میں ذاتی حفاظت اور بقائے اصلاح کی جنگ تھی۔ جو شہزادہ کامیاب ہو جاتا تھا، اسے تخت اور تاج کے ساتھ زندہ رہنے کا بھی حق ہوتا۔ باقی شہزادے اگر قتل نہ بھی کئے جاتے تو قید خانوں میں ضرور بھیج دیئے جاتے۔ خاندانِ مغلیہ میں بھی اس سے قبل بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ ہمایوں نے جب تک کامران کو اندھا کر کے مکہ نہ بھیجا۔ چین سے حکومت نہ کر سکا۔ اکبر نے اسی کامران کے لڑکے کو "ازبکون" کی بغاوت کے دوران قتل کروا دیا۔ تاکہ کوئی دعوے دار موجود نہ رہے۔ جہانگیر نے اپنے لڑکے خسرو کو بغاوت کے الزام میں اندھا کر دیا۔ شاہجہاں نے شہریار اور داور بخش اور ہر ممکن دعویدار کو راستہ سے ہٹا دیا۔ ان مثالوں کو دیکھتے ہوئے اورنگ زیب نے بھی حفاظتِ خود اختیاری کے طور پر مراد کو گرفتار کر لیا۔ اس سے یہ کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ اورنگ زیب نے معاہدہ کی خلاف ورزی کی۔ بلکہ خود مراد سے پہلے ہی معاہدہ میں صاف یہ درج تھا کہ مراد اورنگ زیب کے دوست کو دوست اور دشمن کو دشمن سمجھے گا۔ جب مراد نے خلاف ورزی کی تو معاہدہ ساقط ہو گیا۔ اور اورنگ زیب حفاظتی اقدام اٹھانے کا مجاز تھا۔

اس کے بعد اورنگ زیب نے قید میں مراد کو ہر ممکن آرام و آسائش پہنچانے کی کوشش کی۔

جب اورنگ زیب کے عہد کا آغاز ہوا تو عام طور پر یہ بات عیاں ہوگئی تھی، کہ وہ خدا ترس اور انصاف پسند بادشاہ ہے اور اس کے عہد میں مظلوموں کے ساتھ انصاف ہوگا۔ علی نقی جس کو مراد نے طیش میں آکر صرف شبہ کی بنا پر قتل کر دیا تھا۔ اس کے چھوٹے فرزند نے قصاص کا مقدمہ درج کر دیا۔ اور اورنگ زیب نے قاضی کو گوالیار مراد کے پاس بھیج دیا تاکہ وہ اپنی صفائی پیش کر سکے۔ لیکن مراد نے اقبالِ جرم کر لیا اور قاضی نے مراد کو قصاص میں قتل کئے جانے کا فیصلہ دیا۔ یہ بالکل سیدھی سادی بات تھی۔ لیکن اکثر مؤرخین نے حاشیہ آرائی کر کے مراد کے قتل کو ایک سیاسی چال ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور یہ اعتراض کرتے ہیں کہ یہ مقدمہ "اورنگ زیب کے اشارہ" سے ہوا تھا۔ اور اس بہانہ سے اورنگ زیب نے مراد کو قتل کروا دیا تھا۔

اس سلسلہ میں وہ خافی خان کا بیان پیش کرتے ہیں۔ جس نے تحریر کیا تھا کہ

"شہنشاہ (عالمگیر) کے کسی مقرب کے اکسانے پر علی نقی کے بیٹے نے مراد کے خلاف اپنے باپ کے قتل کا مقدمہ دائر کیا۔ علی نقی کو خود مراد نے قتل کیا تھا"

لیکن یہ الزام بالکل بے بنیاد ہے۔ اورنگ زیب اگر مراد کو قتل کروانا ہی چاہتا۔ تو جس طرح اس نے دارا کے احکامِ قتل پر صاف الفاظ میں لکھ دیا تھا کہ اس کی زندگی رموزِ سیاست کی بنا پر خلاف قانون ہے۔ مراد کے معاملہ میں بھی ایسا ہی کرتا۔ خافی بڑی معصومیت سے یہ بھی تحریر کرتا ہے کہ

"اورنگ زیب علی نقی کے بڑے لڑکے سے جس نے قصاص کا دعویٰ

نہیں کیا تھا۔ بہت خوش تھا۔ اور چھوٹے لڑکے سے جس نے دعوے
کیا تھا بہت عرصہ تک گفتگو نہیں کی ۔"

بہرحال اس سے صاف ظاہر ہو گیا ہے کہ مراد کی گرفتاری سیاسی وجوہ کی بنا پر تھی۔
لیکن اس کا قتل نہ مذہبی تھا نہ سیاسی۔ بلکہ انصاف کا تقاضا تھا جسے پورا کیا گیا۔

اورنگ زیب اور سرمد

اورنگ زیب پر ایک الزام یہ بھی ہے کہ اس نے سرمد کو قتل کروایا۔ اور اس سلسلے میں مشہور نقاد علامہ نیاز فتحپوری نے اورنگ زیب پر سخت تنقید کی ہے اور لکھا ہے کہ آج نہ اورنگ زیب دنیا میں موجود ہے نہ سرمد۔ ان کے مقابر بلاشبہ موجود ہیں۔ مگر قدرت کے اس فیصلہ کو دیکھئے۔ اورنگ زیب کی قبر پر فاتحہ پڑھنے والے خال خال آجاتے ہیں اور سرمد کی قبر پر روزانہ پھولوں کی بارش ہوتی ہے۔ یعنی اورنگزیب کے مزار کا کوئی پرسان حال ہی نہیں ہے۔ کسمپرسی کے عالم میں پڑا ہے۔

ایک نقاد بشیر نشان صاحب روزنامہ حریت کراچی کی ۲۱ مئی ۱۹۶۵ء کی اشاعت میں اورنگ زیب اور سرمد کے معاملے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ہم مسلمان اپنی تاریخ کو بڑی سرعت سے بھول رہے ہیں۔ بہت سے واقعات جن پر ہم فخر کر سکتے ہیں یا تو معلوم نہیں ہیں یا غلط معلوم ہیں۔ کچھ عرصہ قبل پاکستان میں دھوم مچی تھی کہ اورنگ زیب کے مقبرہ کی مرمت کے لیے بھارتی حکومت نے ایک رقم مبلغ ایک سو سینتالیس روپیہ کی مقرر کی ہے۔ پاکستان کے عوام کو چندہ جمع کر کے بھیج دینا چاہیئے۔ کچھ نے کہا حکومت پاکستان کو مرمت کے لیے اپنے روپیہ کا بندوبست کرنا چاہیئے۔ غل شور بہت مچا تو اخبارات کے ذریعہ عوام کے علم میں آیا کہ اس

فقیر منش بادشاہ کے مزار پر کوئی مقبرہ نہیں ہے۔ کچا مزار ہے۔ اورنگ زیب قرآن شریف لکھ کر خاموشی سے ہدیہ حاصل کرتے تھے۔ ٹوپیاں بنا کر بھی فروخت کرتے تھے۔ کسی کو خبر نہ ہوتی تھی کہ اورنگ زیب کا نوشتہ قرآن ہے یا بنائی ہوئی ٹوپی ہے۔ قرآن کے ہدیہ کی بچی ہوئی رقم بوقت انتقال سترہ روپیہ کچھ پیسہ اور ٹوپیوں کی قیمت کی غالباً اس سے بھی کم رقم چھوڑی تھی۔ اورنگ زیب نے اس رقم سے تجہیز و تکفین اور فاتحہ وغیرہ کی وصیّت کی تھی۔ اور وصیت کی تھی کہ یہ رقم اگر کافی نہ ہو تو ان کے بڑے شہزادے کے پاس بھی ذاتی رقم ہے۔ ان سے حاصل کر لی جائے۔ یہ بھی وصیّت کی تھی کہ قبر کچی رکھی جائے اس پر سبزہ کا پودا لگایا جائے۔ اور قبر پر کوئی مقبرہ نہ نہ بنایا جائے۔ بائیسویں خواجہ سید زین الدین شیرازیؒ کے پائیں مبارک اس طرح دفن کی ہدایت تھی کہ جب مزار خواجہؒ کے مزار مبارک کو غسل دیا جائے تو پانی اورنگزیب کے مزار پر سے بہتا ہوا جائے۔ اس وصیت کی تعمیل کی گئی۔

آج تک نہ مقبرہ ہے نہ قبر پختہ۔ خام قبر پر سبزے کا پودا لگا ہوا ہے۔ آخری حضور نظام نے مزار کے اطراف سنگِ مرمر کی خوب صورت جالی اپنے دورِ حکومت میں لگوادی ہے اور فرش بھی سنگِ مرمر کا لگوا دیا ہے۔ قبر کا تعویز بھی سنگِ مرمر کا کھو کھلا ہے۔ اور درمیان سے کھلا ہوا ہے۔ جو مٹی کی قبر پر رکھ دیا گیا ہے۔ مزار کے روبرو ایک چھوٹی سی مسجد اور ایک تلاوت گاہ ہے۔ قرآن کے پارے مہیا ہیں جو زائرین پڑھ کر بخشتے ہیں۔ اورنگ زیب کے مزار کی خدمت کے لیے بارہ گاؤں وقف اور سرکار کی تحویل میں ہیں۔ درس قرآن کے لیے متصل ہی مدرسہ ہے۔ جہاں قرآن خوانی کی آواز کان میں پڑتی رہتی ہے۔ اورنگ زیب کے مزار پر بلا کا نور برستا ہے۔

اور عجب جلال و عظمت عیاں ہے۔ میں نے تو کسی ۔ دشاہ کا مزار ایسا پُر سکون باوقار
اور بارونق نہیں دیکھا جیسا اس غربت پسند بادشاہ کا ہے۔ غریب نما قبر دیکھنے
سے تعلق رکھتی ہے۔ ہر طرف چہل پہل، قرآن کے گنگنانے کی آواز، بائیسویں
خواجہ کا سایہ۔ عجیب پُر کیف فضا چھائی ہوئی رہتی ہے۔ اورنگ زیب خلد آباد
میں مدفون ہیں۔ درحقیقت یہ دنیا میں ایک خُلد ہے۔ یہیں دہلی سے سات
سو اولیاء اللہ کی پالکیاں آکر ٹھہری تھیں۔ اور یہیں سکونت اختیار کی تھی۔

خُلد آباد ریلوے لائن سے ہٹ کر اورنگ آباد سے ۱۴ میل دُور ایک پہاڑی
پر واقع ہے۔ اب تو ایک اچھا پختہ سڑک کا گھاٹ بن گیا ہے

ابتدائی زمانہ تک یہ گھاٹ بڑا دشوار گزار تھا۔ بیل گاڑیاں مشکل سے چڑھتی
اُترتی تھیں۔ اُترتے وقت لُڑھک جانے کے خوف سے جہاں زیادہ ڈھال ہوتا
چاکوں میں ایک ڈانڈا باندھ دیا جاتا تھا۔ اس وقت بھی اورنگ زیب کے مزار
پر حاضری کے لیے سب جاتے تھے، اور اب بھی جاتے ہیں۔ یہ کوئی خوبصورت
عمارت نہیں ہے جس کو دیکھنے جاتے ہوں۔ بلکہ اورنگ زیب کے مزار پر خراج
عقیدت پیش کرنے کے لیے حاضری دی جاتی ہے۔

سرمدؒ کا مزار تو جامع مسجد دہلی کے بڑے دروازہ کے سامنے واقع ہے۔ جو
دہلی والوں کی تفریحگاہ ہے۔ قوالی کے متوالے۔ کباب، کھیر کے شائقین سب ہی
پہنچتے ہیں۔ پہلو میں اوروں کی دکانیں ہیں۔ پھول چڑھانے کی ترغیب دی جاتی
ہے۔ اگر یہ مزار اورنگ کے مزار کیطرح ہٹ کر کہیں اور واقع ہوتا تب دیکھا جاتا
کہ کتنے لوگ عقیدت کے لحاظ سے جاتے ہیں۔ تاج محل اور ہمایوں کے مقبرے

سیاح دیکھنے جاتے ہیں۔ مدفون سے کوئی تعلق نہیں ہوتا محبت کی کہانی سنائی اور نشانی بنائی جاتی ہے۔ بہت کم فاتحہ پڑھتے ہیں۔ اورنگ زیب کے سادہ مزار پر تو عجب کشش ہے۔ سر جھکا جاتا ہے۔ اکثر وائسرائے ہند مزار پر آئے اور ٹوپی اتار کر مؤدب کھڑے رہے ہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو بھی گئے تھے اور مزار پر ہاتھ جوڑے کھڑے رہے، خود ان کی حکومت تھی۔ ریاست تو ختم ہو چکی تھی۔ یہ تو نہ تھا کہ ریاست کے پروگرام پر عمل کی تکمیل ہو۔ ہند سرکار کا ہی بنایا ہوا پروگرام تھا۔ اکا دکا فاتحہ خوانوں کا سوال کیا ہے۔ خدام کی کوئی کمی نہیں ہے۔ یہ سادہ صاف ستھرے لباس میں کھڑے رہتے ہیں۔ اور ادب کی جانب توجہ دلانے کے لیے کچھ ایسے الفاظ کہتے ہیں (صحیح الفاظ تو یاد نہیں) " باادب باتمیز ہوشیار، شہنشاہ عالمگیر آرام فرما ہیں" انگریز اس آواز کے ساتھ ٹوپی اتار کر باادب کھڑے ہو جاتے ہیں۔

اورنگ زیب کی اپنی آخری ابدی آرام گاہ کے متعلق وصیت خود بتا رہی ہے کہ ان کو بزرگان دین سے کس قدر عقیدت تھی۔ اورنگ زیب کے وقف کی آمدنی سے ایک لنگر جاریہ کا انتظام تھا۔ جو مہاراجہ چندو لال وزیر اعظم حیدر آباد کے زمانہ سے سرکاری انتظام کے تحت اب تک جاری ہے۔ ایک بڑی آبادی کی بسر اسی لنگر پر ہے۔ ہر ایک کو ایک چمچہ کھانا ملتا ہے جو ایک چھوٹے تکونہ کے برابر ہوتا ہے۔ ہر مقیم مہمان کا بھی ایک چمچہ کھانا فی وقت مقرر ہو جاتا ہے۔

خلد آباد میں اولیاء اللہ کے بیشمار مزارات ہیں۔ سب ہی کے مجاوروں کو فیض پہنچ رہا ہے۔ اور اورنگ زیب کے صدقہ میں مسلمان بستی آسودہ ہے۔

میں سرمدؒ شہید کا مخالف نہیں ہوں۔ ان کی اور اورنگ زیب کی بڑی عزت کرتا ہوں۔

دونوں اپنے اپنے راستوں پر گامزن تھے۔ اورنگ زیب ان چند زبردست مسلمان بادشاہوں میں تھے جو اندرونی قوت رکھتے تھے۔ اورنگ زیب کا چلن ایسا رہا ہے کہ ان سے مذہب کی آڑ لے کر سیاسی مقاصد کے لیے قتل کرانے کا یقین نہیں کیا جاسکتا۔ سیاسی مقاصد کے تحت سزائے موت دینا مذہبی بنا پر سزائے موت دینے سے اس زمانہ میں زیادہ آسان تھا، اور کم باعثِ اشتعال ہوتا۔ پھر غور طلب بات یہ ہے کہ مخالفانہ تحریک کی قوت ہی کیا ہوسکتی تھی۔ اگر روحانی مخالفت کا ڈر تھا تو سرمدؒ کو قتل کروانے سے یہ خطرہ بڑھ جاتا اور وہ سزائے موت سے زیادہ مؤثر ہوجاتا۔ ایک مجذوب کی بڑ سے ایسی بغاوت اٹھ کر کھڑی نہ ہوسکتی تھی۔ جو اورنگ زیب کا تختہ الٹ سکے۔ بددعا کارگر ہوسکتی تو ہوسکتی تھی۔ مگر اورنگ زیب میں خود روحانی قوت کم نہ تھی۔ البتہ یہ خبر معرضِ بحث میں ہے کہ اورنگ زیب کا یہ عمل کہاں تک صحیح تھا۔ ہر دو جانب سے بہت کچھ کہا جاسکتا ہے۔ بہرحال سرمد کی ذاتی بددعا کے سوائے کوئی —— اور چیز کارگر نہ ہوسکتی تھی۔ جس کا خطرہ اورنگ زیب کو نہ تھا۔ یہ کہنا تو بالکل غیر صحیح ہے کہ دونوں دنیا سے جاچکے ہیں۔ ایک کے مزار پر پھول برستے ہیں۔ اور ہندو مسلمانوں کی عقیدت کا مرکز ہے۔ اورنگ زیب کا مزار اس طرح پڑا ہے کہ خال ہی خال کوئی فاتحہ کے لیے پہنچ جاتا ہو تو پہنچ جاتا ہو۔ اورنگ زیب سے تو مسلمانوں کو بڑی محبت ہے۔ وہ خلوص دل سے فاتحہ پڑھتے ہیں۔ اور اس کے لیے دعائے مغفرت کرتے ہیں۔ یہ کہنا کہ قاضی صاحب سے سرمد نے برا برتاؤ کیا اس لیے انھوں نے ناراض ہوکر انتقام لینے کے لیے دوسروں کو

ہمنوا بنا کر سرمد کی موت کا فتویٰ حاصل کر لیا۔ آجکل جج کو کوئی برا بھلا کہہ دے تو وہ توہینِ عدالت کے مرتکب ہوتے ہیں۔ نفسِ مقدمہ پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اتنے بڑے قاضی سے سخت گفتگو سے متاثر ہو کر اس قدر انتقامی کارروائی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ آجکل بھی مجذوب برا بھلا کہہ دیتے ہیں۔ کوئی کچھ نہیں کہتا۔ ایک پایہ کے قاضی کے متعلق یہ خیال قابلِ غور ہے

سرمد کی سزائے موت پر تبصرہ کرتے وقت یہ بھی غور کر لینا چاہیئے کہ خلفائے راشدین کے زمانہ میں سرمد نے یہ حرکت کی ہوتی تو کیا نتیجہ ہوتا۔ کیا خلفاء کسی کو لاَ اِلٰہ کی آواز بلند کرتے ہوئے مدینہ کی گلیوں میں گھومنے پھرنے کو روا رکھتے۔ اور کیا آج بھی مدینہ میں یہ ممکن ہے کہ کوئی ننگا لا الہ کہتا ہوا پھر سکے۔ منصور کا حشر بھی سب کے سامنے ہے ممکن ہے باطن کے منازل طے کر رہا ہو۔ مگر فیصلہ تو ظاہرہ عمل سے کیا جائے گا۔ دل کا حال خدا جانے۔ اسلامی حکومتیں تو احکام شریعت نافذ کرنے کی ذمہ دار ہیں۔ اور قانون کا اطلاق ہمیشہ ظاہر پر ہوتا ہے۔ باطن پر نہیں۔ باپ بھائیوں کے خلاف سلوک کا بھی مضمون میں ذکر ہے۔ یہ ایک تاریخی چیز ہے۔ اس پر تبصرہ کے لیے بڑی جگہ درکار ہو گی۔

مختصراً اورنگ زیب نے باپ کو قید نہ کیا ہوتا۔ اور بھائیوں کے ساتھ سختی نہ کی ہوتی تو کیا ہوا ہوتا۔ ہمایوں کی نظیر ہمارے سامنے ہے۔

بھائیوں نے نرمی کا کیا صلہ دیا۔ اورنگ زیب کی حیثیت تو ہمایوں سے بہت زیادہ نازک تھی۔ کیا ان بھائیوں نے اورنگ زیب کو زندہ چھوڑا ہوتا؟ اور کیا مسلمان اس خدمت سے محروم نہ ہو گئے ہوتے۔ اورنگ زیب نے مسلمانوں کو کچھ سرحد اور

حکومت کا موقع دیدیا۔ شاہجہاں نے محسوس کرلیا تھا کہ حکومت اسلامیہ کو الٹنے کے لیے اندر ہی اندر آگ سلگ رہی ہے۔ حتیٰ کہ راجپوتوں تک کی وفاداری قابل بھروسہ نہیں رہی تھی۔

داراشکوہ تخت نشین ہوجاتا تو اکبر نے جس غلطی کا آغاز کیا تھا، وہ انتہا کو پہنچ جاتی اور اسلامی حکومتیں بہت پہلے ختم اور مسلمان غیر مسلموں کے غلام ہوکر کبھی کے کمزور ہو گئے ہوتے۔ شاید آبادی بھی اس تعداد میں نہ رہتی۔ ہر طرف سے جب بغاوت کی آندھی اٹھا چاہتی تھی۔ اورنگ زیب کی ہستی تھی جس سے امید بقا پیدا ہوگئی تھی۔ اس کے جانشین ٹھیک نکل جاتے تو اس کی خدمات سے فائدہ اٹھا سکتے تھے۔

عالمگیر و سرمدؒ

من سرِ خود را ز اوّل زیرِ پا دانستہ ام
شہرِ دہلی را بجائے کربلا دانستہ ام

رفت دارا در پےِ منصور و سرمد نیز رفت
دار بازی را رضائے کبریا دانستہ ام

(سرمدؒ)

من شریعت را ز جاں راہِ خُدا دانستہ ام
شہرِ دہلی را فضائے مُصطفٰےؐ دانستہ ام

رفت دارا در پےِ فرعون و سرمد نیز رفت
دار بازی را سزائے اشقیا دانستہ ام

(عالمگیر)

میں نے ابتداء ہی سے یہ سمجھ لیا تھا کہ میرا سر کٹنے کو بے چین ہے میں سمجھتا ہوں یہ شہرِ دہلی نہیں میدانِ کربلا ہے۔ بادشاہ چلا گیا منصور کو پکڑنے اور سرمد بھی چلا گیا۔ میں دار بازی تختۂ مشق ستم کو بزرگ و برتر خدا کی رضا سمجھتا ہوں۔

میں شریعت پر چلنے کو دل و جان سے راہِ خدا سمجھتا ہوں۔ شہرِ دہلی کو اسلامی شہر سمجھتا ہوں، بادشاہ چلا گیا فرعون کو پکڑنے اور سرمد بھی چلا گیا۔ دار بازی کو بدبخت لوگوں کی سزا کا ذریعہ سمجھتا ہوں۔

اورنگ زیب پر ایک الزام یہ بھی ہے کہ اس نے سکھ مذہب کے پیشواؤں سے نہایت ظالمانہ سلوک کیا ہے۔ روزنامہ مشرق لاہور کی ۲۱ نومبر ۱۹۶۹ء کی اشاعت میں سکھ مذہب کا تفصیلی جائزہ پیش کرتے ہوئے میر نور احمد مرحوم لکھتے ہیں:

سکھ مذہب کے بانی اور پہلے گورو بابا نانک صاحب (جن کی پانچسویں سالگرہ آجکل پاکستان کے شہر ننکانا میں بہت اہتمام کے ساتھ منائی جا رہی ہے) ۱۴۶۹ء میں اسی جگہ کے قریب ایک گاؤں میں ایک ہندو کھتری گھرانے میں پیدا ہوئے۔ نوجوانی کے آغاز ہی سے ان کا دل دنیاوی کاموں کی نسبت یادِ خدا اور عبادتِ الٰہی کی جانب زیادہ مائل تھا۔ انہوں نے ہندو دھرم اور اسلام دونوں کا گہرا مطالعہ کیا۔ اس غرض کے لیے انھوں نے ہندوستان کے دھرم استھانوں کی یاترا بھی کی اور مکہ مدینہ اور عراق کے طویل سفر بھی کیے۔ پھر انہوں نے دریائے راوی کے کنارے ایک بستی کرتارپور کے نام سے بسائی اور وہاں بیٹھ کر لوگوں کو اپنے پسندیدہ مذہبی اصولوں کی تعلیم ("سکھشا" جس سے لفظ "سکھ" بنا) دینا شروع کیا۔

جن مذہبی اصولوں کی انہوں نے تبلیغ کی ان میں جزوی طور پر ہندو دھرم کے بعض تصورات کی جھلک بھی نظر آتی تھی۔ لیکن بحیثیت مجموعی ان کے اصول اسلام سے اتنے قریب تھے کہ ان کے زمانے کے لوگ انھیں عملی طور پر مسلمان ہی سمجھتے تھے۔ سب سے پہلی اور بنیادی بات تو یہی تھی کہ بابا نانک صاحب (ہندوؤں کے عام عقائد کے خلاف) خدائے واحد کا وہی تصور پیش کرتے تھے جو اسلام نے پیش کیا تھا۔ اور اسی کی عبادت

کو انسانی زندگی کا سب سے بڑا مقصد قرار دیتے تھے۔ اس خاص اور بنیادی نکتہ پر شاید دنیا کے کوئی دو مذاہب ایک دوسرے کے ساتھ اتنی قریبی مماثلت نہیں رکھتے۔ جتنی اسلام اور سکھ مذہب رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے انسانی مساوات کے اصول کو اپنایا اور پیدائشی ذات پات کی اونچ نیچ کی بجائے (اسلام کی طرح صرف نیک اعمال کو انسان کی فضیلت کا صحیح معیار ٹھہرایا) لہذا مسلمان انھیں ایک خدا پرست۔ انسان دوست پاکیزہ زندگی رکھنے والا۔ پیدائش کے لحاظ سے ہندو لیکن عقائد کے لحاظ سے مسلمان صوفی گردانتے تھے۔

اسلام اور سکھ مذہب میں یگانگت

گورونانک سمیت سکھ مذہب کی تاریخ میں یکے بعد دیگرے دس گورو ہوئے ہیں۔ ان کا زمانہ تقریباً دو سو سال پر پھیلا ہوا تھا۔ اس زمانے کے حالات کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اور سکھ مذہب کے درمیان یگانگت کی بنا پر مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان عام طور پر بھائی چارے اور خورشدلانہ ہمسائیگی کے تعلقات کارفرما رہے۔ تاریخ کے مستند واقعات اس چیز کی بہت واضح جھلکیاں پیش کرتے ہیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ جو افراد اپنی ذاتی اہمیت کی وجہ سے پبلک کاموں میں مؤثر کردار ادا کرنے کے قابل ہوتے ہیں خواہ وہ سکھ گورو ہوں، مسلمان صوفی ہوں یا محض سیاسی حیثیت رکھنے والے انسان ہوں کبھی کبھار حکومتِ وقت سے متصادم بھی ہو جاتے ہیں۔ لیکن سکھ گورو صاحبان کے زمانے کی تاریخ اس بات کے واضح ثبوت پیش کرتی ہے کہ اگر گورو صاحبان اور اس زمانے کے مغلیہ حکومت کے درمیان کبھی اس قسم کا حادثہ پیش آیا تو اس سے سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان دوستی کی عام فضا متاثر نہ ہوئی۔

وہ واقعات جنہوں نے اس فضا کو بعد میں مکدر کیا، گورو صاحبان کے زمانے کے بعد رونما ہوئے دونوں زمانوں کی الگ الگ "تاریخ" اس قابل ہے کہ اس کے واقعاتی پہلوؤں کا حقیقت پسندانہ مطالعہ اور تجزیہ کیا جائے۔ اس مضمون میں صرف پہلے دو سو سال کے حالات کا مختصر جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔

پہلے گورو یعنی بابا نانک صاحب مغلیہ خاندان کے پہلے شہنشاہ بابر کے ہمعصر تھے۔ یہ بات تاریخ کے طالب علموں کو عام طور پر معلوم ہے کہ ان دونوں کی ملاقات محض اتفاقیہ طور پر ہو گئی۔ لیکن ایک مختصر ملاقات بابر کو متاثر کرنے کے لیے کافی تھی۔ اور اس مغل شہنشاہ نے بابا نانک کی تعظیم و تکریم اسی طرح کی جسطرح وہ مسلمان خدارسیدہ صوفیوں کی کرتا تھا۔

بابر کے پوتے شہنشاہ اکبر نے اپنے زمانے کے سکھ گورو یعنی (تیسرے) گورو امرداس کو وہ قطعہ زمین دیا جہاں سکھوں کی مرکزی عبادت گاہ (اس زمانے کا "ہری مندر" اور آج کا مشہور "گولڈن ٹمپل") تعمیر ہوا۔ امرتسر کا شہر اسی عمارت کے گرد معرض وجود میں آیا۔ اکبر نے گورو کی بیٹی کے جہیز کے لیے کئی گاؤں کی جاگیر بھی اس کے نام کر دی۔ گورو ارجن اور ان کے بعد آنیوالے پانچ گورو اسی خاتون کے بیٹے، پوتے یا پڑپوتے تھے۔

گورو ارجن (پانچویں گورو) کے زمانے تک مسلمانوں اور سکھوں کے باہمی تعلقات کا ایک منہ بولتا ثبوت یہ تھا کہ جب اس گورو نے "ہری مندر" کی تعمیر شروع کی تو اس کا سنگ بنیاد رکھنے کے لیے اس زمانے کے ایک ممتاز مسلمان صوفی (حضرت میاںمیر) کو دعوت دی۔ اور میاں میر صاحب نے اس دعوت

کو بہ خوشی قبول کیا۔ یہ واقعات کی عجیب ستم ظریفی تھی کہ مغل حکومت کے ساتھ سب سے پہلے تصادم بھی گورو ارجن ہی کا ہوا۔ لیکن اس بات کا مذہب سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس تصادم کے پس منظر میں جو وجوہات کارفرما تھیں۔ ان کے متعلق اکثر مؤرخ (سکھ، مسلمان، انگریز) متفق ہیں۔

اصل بات یہ تھی کہ لاہور کا ایک ہندو سیٹھ چندو شاہ (جو اس زمانے میں لاہور کے گورنر کا خزانچی اور مشیر مال تھا) اپنی بیٹی کی منگنی گورو ارجن کے فرزند سے کرنا چاہتا تھا۔ واضح رہے کہ اس زمانے تک سکھ گورو کی گدی اپنے مالی وسائل اور معتقدین کی تعداد کے لحاظ سے راجاؤں کی گدیوں کے مانند نظر آتی تھی۔ چندو شاہ نے ذاتی طور پر گورو کی خدمت میں پیغام بھجوائے لیکن اس سے پہلے کچھ ایسے واقعات ہو چکے تھے جن کی وجہ سے گورو نے یہ درخواست ٹھکرا دی۔ سیٹھ چندو شاہ نے اسے اپنی انتہائی توہین سمجھا اور انتقام لینے کا تہیہ کر لیا۔

اسے انتقام کا موقعہ اس وقت ملا جب جہانگیر اپنے باغی بیٹے خسرو کے تعاقب میں لاہور آیا۔ خسرو نے دہلی سے لاہور کی جانب بھاگتے ہوئے راستے میں گورو ارجن سے امداد کی درخواست کی تھی۔ گورو نے اسے کوئی عملی امداد نہیں دی۔ شاید رسمی آشیرباد دے دیا ہو۔ لیکن دونوں کی محض ملاقات کی بنا پر سیٹھ چندو شاہ کو بادشاہ کے کان بھرنے کا موقعہ مل گیا۔ اور بادشاہ نے گورو کو خسرو کے حامیوں میں شمار کر کے بھاری جرمانے کی سزا دی۔ اور جرمانے کی ادائیگی سے انکار پر انہیں لاہور کے قلعہ میں قید کر دیا۔

واضح رہے کہ اسی بادشاہ نے ایک موقعہ پر ایک ممتاز مسلمان مذہبی راہنما

(حضرت مجدد الف ثانیؒ) کو بھی قید میں ڈال دیا تھا۔

قید خانے میں گورو ارجن کو اذیت دی گئی جس سے تنگ آکر گورو نے ایک دن دریائے راوی میں اشنان کی اجازت حاصل کی اور اپنے آپ کو دریا کی لہروں کے حوالے کر دیا۔ گورو کے ہم عصر اور وفادار سکھ بخوبی سمجھتے تھے کہ یہ سب کچھ سیٹھ چندو شاہ کے جذبہ انتقام اور ذاتی اثر ورسوخ کی وجہ سے ہوا۔ انہوں نے گورو ارجن کے گیارہ سالہ بیٹے (چھٹے گورو ہر گوبند) کو بھی بتایا۔ یہی بات نوعمر گورو کے ذہن پر نقش رہی اور وقت آنے پر انہوں نے اپنے باپ کے خون کا بدلہ چندو شاہ کے خون سے لیا۔

جو جرمانہ گورو ارجن نے ادا نہ کیا تھا۔ اس کے عوض نوعمر گورو ہر گوبند کو بھی کچھ عرصہ گوالیار کے قلعہ میں قید رہنا پڑا۔ لیکن بعد میں امرائے دربار کے سمجھانے پر جہانگیر نے نہ صرف گورو کو رہا کر دیا بلکہ بعد میں ان کی وہی حیثیت تسلیم کر لی جو اس زمانے میں "منصب داروں" کو حاصل تھی۔ جس میں اپنی ذاتی فوج رکھنے کا حق حاصل تھا۔ گورو ہر گوبند کے اصطبل میں آٹھ سو گھوڑے تھے۔ تین چار سو مسلح سواران کے باڈی گارڈ میں شامل تھے۔ یہ پہلے گورو تھے جو سپاہیانہ مشاغل (گھڑ سواری، شکار، شمشیر زنی وغیرہ) کا خاص شوق رکھتے تھے۔ ان کی زندگی کے معلوم واقعات سے کسی دور رس سیاسی پروگرام کا پتہ نہیں چلتا۔ لیکن اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ وہ اپنے ذاتی حقوق کی خاطر ایک نڈر اور من چلے انسان کی طرح تلوار اٹھانے اور ہر مخالف کے ساتھ (خواہ وہ کوئی سرکاری عامل ہو یا غیر سرکاری حیثیت رکھتا ہو) ٹکرانے سے کبھی دریغ نہ کرتے تھے۔ ان کی زندگی کے واقعات سے ایک اور بات بھی بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔ گورو ارجن جس المیہ کا شکار ہو چکے تھے۔ گورو ہر گوبند اور ان کے پیرو اسے

حقیقت پسندانہ رنگ میں دیکھتے تھے۔ اس المیہ کی وجہ سے سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان عام طور پر دوستانہ تعلقات میں کوئی فرق نہ پڑا۔ سیٹھ چندو شا کو پکڑوا کر لاہور سے امرتسر منگوانے اور قتل کرنے میں گورو ہرگوبند کو لاہور کے مسلمان سرکاری افسروں کا جو ان کے دوست تھے پورا تعاون حاصل تھا۔ ان کی فوج میں اکثریت مسلمان پٹھانوں کی تھی۔ اور شکار کے شوق کے سلسلے میں کئی مسلمان ان کے خاص دوست تھے۔

جہانگیر محض لگائی بجھائی کی بنا پر گورو ارجن کے خلاف سخت کارروائی پر آمادہ ہو گیا تھا۔ لیکن اسی قسم کے ایک موقعہ پر شہنشاہ اورنگ زیب نے (جو اپنے دادا سے مختلف اور ٹھنڈا دماغ رکھتا تھا) بالکل مختلف رویہ کا ثبوت دیا۔ اس کا بڑا بھائی شہزادہ داراشکوہ اکثر صوفیا کی خدمت میں حاضری دیا کرتا تھا۔ اسی طرح وہ اس زمانے کے گورو ہررائے (ساتویں گورو) کے پاس بھی حاضر ہوتا تھا اس تعلق قلبی کے باعث گورو ہررائے نے داراشکوہ اور اورنگ زیب کے درمیان "جنگِ وراثت" کے سلسلہ میں بہت واضح طور پر داراشکوہ کی امداد کی۔ مستند تاریخ نگاروں (سرکار کننگھم) کے بیان کے مطابق جب داراشکوہ دہلی سے لاہور کی طرف بھاگ رہا تھا تو گورو ہررائے کے آدمیوں نے اورنگ زیب کی فوج کا جو داراشکوہ کی فوج کا تعاقب کر رہی تھی راستہ روک کر تاخیر پیدا کرنے کی کوشش کی۔

گویا اورنگ زیب کو گورو ہررائے سے حقیقی شکایت ہو سکتی تھی۔ لیکن اس بادشاہ نے جو عملی کارروائی کی وہ یہ تھی کہ گورو کو دہلی بلایا اور گورو صاحب کے بھیجے ہوئے ڈیلی گیشن (جس کا سربراہ گورو صاحب کا بڑا بیٹا رام رائے تھا) کے

کے ساتھ گفتگو کرنے کے بعد ماضی کو "رفت و گزشت" کہہ کر آئندہ کے لیے دوستانہ تعلقات قائم رکھنے پر آمادہ ہو گیا۔ گورو کے وکیل (رام رائے) کو اس کے دربار میں وہی عزت اور حیثیت حاصل رہی جو دوست راجاؤں کے وکیلوں اور سفیروں کو دی جاتی تھی۔ کچھ عرصہ بعد اس نے رام رائے کو سکھ گوردوارہ تعمیر کرنے کیلئے ڈیرہ دون میں زمین بھی دی۔ یہ گوردوارہ غالباً ابھی تک موجود ہے۔" تاہم جب گورو ہر رائے کی وفات (۱۶۶۱ء) پر ان کی وصیت کے مطابق رام رائے کا چھوٹا بھائی (آٹھواں گورو ہری کرشن) گدی پر بیٹھا اور رام رائے نے اورنگ زیب کے دربار میں اپنی اعلیٰ حیثیت کے پیش نظر بادشاہ سے دخل اندازی کی درخواست کی تو بادشاہ نے دخل دینا مناسب نہ سمجھا۔

اورنگ زیب کی صُلح پسندی

تھوڑے ہی عرصے کے بعد جب گورو تیغ بہادر گورو نامزد ہوئے تو رام رائے نے پھر کوشش کی کہ شہنشاہ دخل اندازی کرکے اسے گورو کی گدی پر بیٹھنے کا موقع دے۔ لیکن اورنگ زیب نے پھر بھی کوئی دخل نہ دیا۔ ان واقعات سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ اورنگ زیب کو نہ سکھ مذہب سے کوئی پرخاش تھی۔ نہ سکھوں کی ناراضگی مول لینے کا کوئی شوق تھا۔ لیکن یہ افسوسناک اتفاقات تھے کہ سکھوں کی تاریخ کے کئی مشہور المیے اسی شہنشاہ کے عہد میں رونما ہوئے۔ لیکن اگر اصل واقعات کے مختلف پہلوؤں کا بہ غور مطالعہ کیا جائے تو حالات کی عجیب تصویر سامنے آتی ہے۔ جو اس تصویر سے بالکل مختلف ہے جو انگریزی عہد کی نصابی تاریخیں لکھوانے والے

عام طور پر پیش کرتے رہے ہیں

پہلا المیہ وہ تھا جو گورو تیغ بہادر اور ایک مسلمان پیر حافظ آدم کے خلاف دہلی کے قاضی کی عدالت میں مقدمہ کی صورت میں رونما ہوا۔ اس مقدمے میں قاضی نے باغیانہ سرگرمی کے الزام میں گورو تیغ بہادر کو سزائے موت دی اور حافظ آدم کو (اس کی اس التجا پر کہ وہ مرنے سے پہلے ایک مرتبہ حج کی سعادت حاصل کرنا چاہتا ہے) ملک بدر کرنے کی سزا دی۔ اس مقدمے کے واقعات سے قطع نظر (جو بجائے خود سکھ گورو اور مسلمان پیر کے درمیان اشتراکِ عمل ظاہر کرتے ہیں) اگر قاضی نے غلط فیصلہ دیا یا سزا کے معاملے میں بے جا سختی یا بددیانتی سے کام لیا۔ تب بھی یہ ایک فرد واحد کا فعل تھا۔ جس سے اورنگ زیب کا یا اس کی نام نہاد پالیسی کا کوئی تعلق قطعاً نہ تھا۔ بلکہ اس بات کا قطعی ثبوت موجود ہے۔ (سکھ مورخ خشونت سنگھ نے بھی اس بات کو بہ طور امر واقعہ تسلیم کیا ہے)، کہ یہ تمام واقعہ ایسے وقت میں ہوا جب اورنگ زیب دہلی میں موجود ہی نہ تھا۔ بہ ظاہر یہ اس کی لاعلمی میں ہوا۔

گورو گوبند سنگھ اور صوفی بدھو شاہ

اس المیہ کی وجہ سے سب سے زیادہ رنج اور صدمہ گورو تیغ بہادر کے نوسالہ فرزند (آئندہ سکھ تاریخ کے دسویں اور بہت مشہور گورو گوبند سنگھ) کو پہنچا۔ لیکن گورو گوبند سنگھ نے اس واقعہ سے جو تاثر لیا۔ اس میں سکھ، مسلم دشمنی کا کوئی عنصر ہرگز شامل نہ تھا۔ جس کا روشن ثبوت یہ ہے کہ جب گورو گوبند سنگھ نے بیس سال کی عمر کو پہنچ کر اپنی زندگی کے پروگرام کی جانب پہلا قدم اٹھایا تو ایک مسلمان

صوفی سید بدھو شاہ کے مشورے اور تعاون سے اٹھایا۔ اور سید بدھو شاہ نے جان پر کھیل کر اور اپنے بیٹے کی جان گنوا کر گورو صاحب کا ساتھ دیا۔ اس واقعہ کی کچھ تفاصیل بھائی گیان سنگھ گیانی نے اپنی اردو کتاب "تاریخ گورو خالصہ" حصہ اوّل (مطبوعہ خالصہ ایجنسی پریس۔ امرتسر) میں مہیا کی ہیں جو کئی لحاظ سے بہت معنی خیز ہیں۔

نوجوان گورو نے اپنی تعلیم و تربیت کے دس گیارہ سال ایک مقام پونٹہ دریا ست نوہن میں گزارے تھے (جب ان کی عمر بیس برس کی تھی۔ بھائی گیان سنگھ کے الفاظ ہیں :

"انہی ایام میں سید بدھو شاہ فقیر قصبہ ساڈھورہ سے ان (گورو صاحب) کو ملنے آیا اور معرفت الہٰی اور عشق حقیقی کا باہم خوب چرچا کیا۔۔۔۔۔ اسی اثنا میں انہوں نے سرداران کالے خاں، نجابت خاں وغیرہ باشندگان داملہ کو مع پانچسو سواروں کے جو بادشاہی عتاب میں آکر بھاگے پھرتے تھے۔ اور کوئی راجگان راجپوت میں سے ان کو مارے خوف کے پناہ نہیں دیتا تھا۔ سید بدھو شاہ کی سفارش پر اپنے پاس نوکر رکھ لیا۔۔۔۔۔۔"

اس فوجی جمعیت سے اس مرحلے پر کیا کام لینا مقصود تھا اس کی کوئی توضیح بھائی گیان سنگھ کی کتاب میں نہیں کی گئی۔ لیکن اگر آئندہ واقعات کو پیش نظر رکھا جائے تو قیاس کیا جا سکتا ہے کہ جس منصوبے پر گورو گوبند سنگھ اور سید بدھو شاہ نے اتفاق اور باہم تعاون کا ارادہ کیا وہ کوہستان شوالک کی آبادی کو سکھ مذہب کے ذریعے خدا پرستی کی جانب لانے کا تھا۔ کوہستان شوالک ہمالیہ کے دامن میں ایک

وسیع علاقہ ہے۔ جو دریائے ستلج اور دریائے جہلم کے درمیان پھیلا ہوا ہے۔ اور اب "ہماچل پردیش" کہلاتا ہے۔

گورو گوبند سنگھ تقریباً تمام عمر اسی علاقے میں مصروف کار رہے۔ یہ علاقہ کئی راجاؤں کی نیم خود مختار ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ جو مغلیہ حکومت کی باجگذار تھیں۔ مقامی آبادی عجیب مذہبی توہمات اور جہالت میں مبتلا تھی۔ منصوبہ غالباً یہ تھا کہ اگر ہندو راجے اس آبادی کو سکھ مذہب کے زیر اثر خدا پرست بنانے کے نیک کام کی مزاحمت کریں۔ تو طاقت کا جواب طاقت سے دیا جائے۔

ظاہر ہے کہ سید بدھو شاہ جو گورو کے ساتھ (بقول بھائی گیان سنگھ) "معرفت الٰہی اور عشق حقیقی کا باہم چرچا" کرنے کے لیے آئے تھے۔ گورو صاحب کو صوفیائے اسلام کے سلسلوں سے ملتے جلتے روحانی سلسلے کا گدی نشین سمجھتے تھے۔

ہندو راجاؤں نے فوراً خطرہ محسوس کیا۔ اور گورو صاحب کو بزور پونٹہ سے نکالنے کی کوشش کی۔ اور ان پانچسو سواروں کو جو گورو کی فوج میں شامل ہو گئے تھے۔ لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا۔ جب ان نازک حالات کی اطلاع سیّد بدھو شاہ کو پہنچی تو وہ اپنے اور گورو صاحب کے مشترکہ پروگرام کو ناکامیابی سے بچانے کے لیے فوراً اپنے دو ہزار مسلح مریدوں کے ساتھ پونٹہ پہنچے۔ بھائی گیان سنگھ کے الفاظ میں:

"وہ (سیّد بدھو شاہ) اسی وقت دو ہزار سوار و پیادہ کی جماعت لے کر فوراً ان کی مدد کے لیے آ پہنچا۔ اس کے آتے ہی میدان خوب گرم ہو گیا...... آخر کار راجگان کوہستان کی سپاہ بددل ہو گئی۔

اور مقابلے کی تاب نہ لاسکی اور پیچھے بھاگ نکلی۔ گورو صاحب کی فوج نے کئی کوس تک اس کا تعاقب کیا اور بہت کو بے حال و زخمی کیا۔ ان کا جو مال اسباب تھا وہ بھی لوٹ لیا۔ اگرچہ اس طرف سے (گورو صاحب کی طرف سے) بھائی سنگھیا، جیت مل وغیرہ بہادراں اور سید بدھو شاہ کا بیٹا بھی کام آئے۔ مگر چونکہ فتح اس طرف کی ہوئی تھی۔ اس وجہ سے ان کا چنداں افسوس نہ ہوا۔

یہ بھی گورو گوبند سنگھ کی لڑائی جو پونٹہ کے قریب "بھنگانی" کے مقام پر ۱۶۸۶ء میں لڑی گئی۔

پھر ایک اور واقعہ پیش آیا۔ جو اس سے بھی زیادہ معنی خیز تھا۔ گورو گوبند سنگھ نے اپنا صدر مقام پونٹہ سے انند پور تبدیل کر لیا۔ یہ جگہ بھی (جو ان کے والد نے زمین خرید کر آباد کی تھی) کوہستان شوالک ہی میں بلاسپور کے راجہ بھیم چند کی ریاست میں تھی۔ پہلے اس نے اپنی ریاست میں گورو کے قیام پر اعتراض کیا۔ پھر پینترہ بدل کر یہ ظاہر کیا کہ تمام راجے گورو صاحب کے تابع ہو جائیں گے۔ اگر وہ ان کے لیڈر بن کر مغلیہ حکومت کے افسر کی (جو خراج کی رقوم وصول کرنے کے لیے آرہا تھا) مزاحمت کریں۔ گورو نے یہ بات مان لی۔ لیکن ہندو راجہ دوسری چال چل رہے تھے۔ انہوں نے ایک طرف گورو کی زیر قیادت مغل افسر (حسین خاں) سے جنگ شروع کی۔ دوسری طرف گورو کے پس پشت حسین خاں کے ساتھ صلح کر کے اس سے کچھ رعایت حاصل کر لی۔ اور تصادم کا الزام گورو صاحب کے سر تھوپ دیا۔ گورو صاحب راجاؤں سے بددل ہو کر انند پور میں جا کر بیٹھ گئے۔ اس تمام واقعہ کی رپورٹ شہنشاہ اورنگ زیب کو پیش کی گئی۔ تو اس نے جو حکم دیا وہ یاد رکھنے کے قابل ہے۔

حکم یہ تھا کہ مفاہمت کا کوئی سوال نہیں۔ راجاؤں سے پوری رقم اور اس کے علاوہ تاوان وصول کیا جائے۔ لیکن گورو صاحب سے کوئی تعرض نہ کیا جائے۔ چنانچہ اس حکم کی تعمیل اسی طرح جنرل مرزا بیگ نے کی۔ اس طرح گورو صاحب کو پہاڑی راجاؤں سے امن وامان کے دس گیارہ سال ملے۔ یہی زمانہ ان کی سب سے زیادہ نتیجہ خیز سرگرمیوں کا تھا۔ اس زمانے میں انہوں نے سکھوں کی نئے خطوط پر تنظیم کی۔ انہیں رہن سہن، شکل وصورت۔ لباس اور روزمرہ کی زندگی کے آداب کے لحاظ سے ہندوؤں سے الگ سماج کی شکل دی۔ ان کے اندر اپنی قومیت کا جذبہ بیدار کیا۔ انہیں ایک مذہبی حکم کے طور پر ہتھیار بند کیا۔ اور ایک نئی قوم کی حیثیت سے پنجاب کی آئندہ تاریخ میں شامل کر دیا۔

شہنشاہ اورنگ زیب کو ایک مرتبہ پھر دہلی سے دُور دکن میں ایک طویل جنگی مہم کے لئے جانا پڑا۔ ہندو راجاؤں نے طویل خاموشی کے بعد اس موقعہ سے فائدہ اُٹھایا ایک طرف انہوں نے انندپور پر حملہ کر دیا اور دوسری طرف دہلی دربار سے مدد مانگی۔ انہوں نے غالباً دہلی میں کسی افسر مجاز کے ساتھ طے کر لیا تھا کہ اگر وہ دربار کے باجگذار راجاؤں کی حیثیت سے کسی "فساد وغیرہ" کو فرو کرنے کے لیے مدد مانگیں تو مدد دی جائے گی۔ چنانچہ ان کی اپیل پر مغل فوج کے دستے بھی راجاؤں کی امداد کے لیے آگئے۔

ہندو راجاؤں کی چال

اس لڑائی میں گورو گوبند سنگھ کو المناک مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کا

گھر بار لٹ گیا۔ ان کے ساتھ بہت تھوڑی جمعیت رہ گئی۔ اور ان کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔ ان نازک حالات میں جب محاصرہ سے بچ نکلنے کی بہ ظاہر کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ گورو صاحب کے دو مسلمان جاں نثار ان کی مدد کو پہنچے۔ ان کے نام (غنی خاں اور نبی خاں) سکھوں کی تاریخ میں محفوظ ہیں۔ انہوں نے رات کے وقت گورو صاحب کو پالکی میں بٹھایا اور انھیں اپنا پیر ظاہر کر کے سنتریوں کے پہرہ سے نکال کر لے گئے۔ یہاں سے گورو صاحب نے سیدھا اپنے ایک اور مسلمان دوست کے گاؤں کا رخ کیا۔ یہ دوست (کننگھم کے قول کے مطابق) موضع بہلول پور کا ایک شخص پیر محمد تھا۔ اس کے پاس قیام کے دوران گورو صاحب نے اپنی منتشر جماعت کو پھر کسی حد تک جمع کیا اور پھر ایک مقابلتاً محفوظ مقام پر پہنچ گئے۔

یہاں گورو صاحب نے ان تمام واقعات کے متعلق اپنا تاثر اور ردِّ عمل ایک فارسی نظم "ظفر نامہ" کی صورت میں قلم بند کیا۔ اور یہ نظم ایک معتمد قاصد (بھائی دیا سنگھ) کے ہاتھ دکن بھجوائی۔ اس نظم کے متن کے ساتھ یہ عجیب حادثہ گزر چکا ہے کہ گورو صاحب کے پیروؤں نے اسے گورمکھی رسم الخط میں محفوظ کیا۔ پھر بہت دیر کے بعد اسے فارسی رسم الخط میں منتقل کیا گیا۔ جس سے اس کے اشعار اور الفاظ بہت ہی الٹ پلٹ ہو گئے ہیں۔ تاہم جس شکل (یا شکلوں) میں یہ نظم اب دستیاب ہوتی ہے اس سے گورو صاحب کا اس زمانے کا اندازِ فکر واضح ہو جاتا ہے۔ اس نظم میں اس بات پر سخت تعجب ظاہر کیا گیا ہے کہ بادشاہ کی افواج ان کے خلاف ظالم پہاڑی راجاؤں کی مدد کرنے کے لیے آئیں۔ ایک شعر اس طرح پڑھا جاتا ہے۔

"منم کشتہ کوہیاں بُت پرست
کہ آں بت پرستند و من بت شکست"

اس بات کی شکایت کی گئی ہے کہ مغل فوج کے سرداروں نے قرآن پر ہاتھ رکھ کر انہیں حفاظت کا یقین دلایا۔ لیکن جب اس یقین دہانی پر گورو صاحب قلعہ (انندپور) سے باہر نکل آئے تو ان پر حملہ کر دیا۔ اور اس بات پر بار بار زور دیا گیا ہے کہ بادشاہ کے بخشی اور دیوان جھوٹے ہیں۔ جن پر کوئی اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔

گورو گوبند کی زندگی کا آخری سال اورنگ زیب کے جانشین بہادر شاہ کی رفاقت میں گزرا۔ بہادر شاہ نے ان شکایات کے متعلق جو گورو صاحب کو تھیں تحقیقات اور انصاف کا وعدہ کیا۔ لیکن وہ اپنے نزدیک بعض دوسرے مسائل کو مقدم سمجھتا تھا۔ اور کچھ عرصہ ان میں الجھا رہنے کے بعد وہ اپنے بھائی کام بخش سے نپٹنے کیلئے دکن کے سفر پر روانہ ہو گیا۔ گورو گوبند سنگھ کی رسمی ملاقات بہادر شاہ کے ساتھ آگرہ کے قلعہ میں ایک دربار کے موقعہ پر ہوئی تھی۔ جہاں اس نے گورو کو (ہمعصر مؤرخ خافی خاں کے بیان کے مطابق ایک مرصع سرپیچ اور ساٹھ ہزار روپیہ کے تحائف دیئے تھے۔ اس کے بعد گورو اپنے دو تین سو نیزہ برداروں کے ساتھ تقریباً متواتر بادشاہ کے شریکِ سفر رہے۔

واقعات کا یہ طویل سلسلہ تاریخ کا ایک سبق آموز باب ہے۔ گورو گوبند سنگھ کی زندگی کے آخری چند سال ایک کے بعد دوسرے المیہ کا منظر پیش کرتے ہیں لیکن

ان واقعات میں گورو صاحبان اور ان کے مسلمان دوستوں کے درمیان بھائی چارے اور انتہائی پرخلوص دوستی کی جھلکیاں بہت واضح طور پر نظر آتی ہیں۔ حکومتی عمال کی غلط کاریوں کے علاوہ (جن کا شکار ہر مذہب کے افراد ہوتے ہیں) سکھ مسلم دشمنی یعنی مذہب کی بنا پر ایک دوسرے کو دشمن سمجھنے کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا۔

پاکستان میں سکھوں کے ۱۳۰ متبرک مقامات ہیں

گوردواروں کی دیکھ بھال پر ہر سال لاکھوں روپے خرچ کئے جاتے ہیں

حکومت پاکستان تمام اقلیتی فرقوں کے مذہبی جذبات کا پورا پورا احترام کرتی ہے۔ اور ان کی عبادت گاہوں کے تقدس کو برقرار رکھنے میں پیش پیش ہے۔ حصول آزادی کے بعد سکھوں کے انخلاء سے جو گوردوارے پاکستان میں رہ گئے تھے، ان کی مناسب دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ ان کی مرمت اور تزئین کے لیے خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ اور اس سلسلے میں ایک خطیر رقم ہر سال خرچ کی جاتی ہے۔

۱۹۶۰ء میں متروکہ اوقاف بورڈ کا قیام عمل میں آیا۔ سکھ گوردواروں کو اپنی

اپنی تحویل میں لینے کے بعد اس بورڈ نے مذہبی امور کی مختلف کمیٹیاں قائم کی ہیں۔ جن میں سکھوں کو بھی نمائندگی دی گئی ہے۔ ان کمیٹیوں کی رائے کو وقعت دی جاتی ہے۔ اور متعلقہ سکھ گوردواروں کی مرمت اور اصلاح کے معاملے میں ان کے مشوروں پر عمل کیا جاتا ہے۔

اس وقت مغربی پاکستان کے مختلف اضلاع میں تقریباً ۱۳۰ گوردوارے ہیں ہر سال اہم تقاریب کے موقع پر ہندوستان، افغانستان اور ایران سے ہزاروں سکھ زائرین ان گوردواروں پر حاضری دیتے ہیں۔ ان تقاریب میں سوات اور قبائلی علاقوں میں رہائش پذیر سکھ حضرات بھی شرکت کرتے ہیں۔

گورو نانک کے جنم استھان ہونے کی حیثیت سے ننکانہ صاحب انتہائی تقدس کا حامل ہے۔ اس قصبہ میں سکھوں کے مندرجہ ذیل گوردوارے موجود ہیں۔

۱۔ گوردوارہ جنم استھان :۔ یہ گوردوارہ اس مقام پر بنایا گیا ہے۔ جہاں گورو نانک جی مہاراج آج سے پانچسو سال پہلے پیدا ہوئے تھے۔

۲۔ گوردوارہ کیارا صاحب :۔ یہ گوردوارہ اس مقام پر تعمیر کیا گیا۔ جہاں گورو جی اپنے مویشی چرایا کرتے تھے۔ اس ضمن میں کہا جاتا ہے کہ ایک دن گورو جی کے مویشیوں نے ایک کھیت کو اجاڑ دیا۔ اور گورو جی نے اس اجڑے کھیت کو دیکھتے ہی دیکھتے ہرا بھرا کر دیا۔

۳۔ گوردوارہ تمبو صاحب :۔ یہ گوردوارہ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے تعمیر کرایا تھا۔ سکھوں کی روایت کے مطابق چوہڑ کانہ سے "سچا سودا" کرنے کے بعد واپس آئے تو گورو جی نے اپنے ساتھی کے ہمراہ اس جگہ قیام فرمایا تھا۔

۴۔ گوردوارہ پٹی صاحب :۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جس جگہ یہ گوردوارہ تعمیر کیا گیا ہے وہاں گوروجی نے ایک مولوی صاحب سے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی۔

۵۔ گوردوارہ بال لیلا صاحب :۔ جس جگہ یہ گوردوارہ موجود ہے۔ وہاں گوروجی بچپن میں اپنے ہمعصر ساتھیوں سے کھیلا کرتے تھے۔

۶۔ گوردوارہ مال جی صاحب :۔ اس جگہ گوروجی اپنے مویشی چرایا کرتے تھے اور آرام فرمایا کرتے تھے۔

دیگر مشہور گوردوارے حسب ذیل ہیں۔

(۱) گوردوارہ سچا سودا :۔ یہ گوردوارہ ضلع شیخوپورہ کے قصبہ چوہڑ کانہ کے قریب واقع ہے۔ اور اسے سکھوں نے گوروجی کے سچے سودے کی یاد میں تعمیر کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ گوروجی کے والد نے کچھ رقم انہیں تجارت کی غرض سے دی۔ لیکن گوروجی نے یہ رقم چوہڑ کانہ میں بھوکے درویشوں کو کھانا کھلانے پر صرف کر دی۔

(۲) گوردوارہ کبو بابا صاحب :۔ یہ گوردوارہ موضع جے سکھ تحصیل پھالیہ ضلع گجرات میں واقع ہے۔ کہا جاتا ہے کہ گوروجی نے اس مقام پر محو ریاضت ایک مغرور ہندو سادھو کو نصیحت کی تھی۔

(۳) گوردوارہ بابا دی بیری :۔ یہ گوردوارہ بابا دی بیری سیالکوٹ شہر میں واقع ہے۔ یہاں ایک بیری کا درخت تھا۔ جس کے نیچے ایک روایت کے مطابق گوروجی نے آرام فرمایا تھا۔

(۴) گوردوارہ کرتار پور صاحب :۔ یہ گوردوارہ سکھوں نے گوروجی کی آخری

یادگار کے طور پر بنایا تھا۔ اس جگہ گوروجی نے ۱۵۳۹ء میں وفات پائی تھی۔

(۵) گوردوارہ ٹبہ بابا نانک :۔ سکھ مؤرخین کے قول کے مطابق گوروجی ڈیپالپور جاتے ہوئے یہاں قیام فرمایا تھا۔

(۶) گوردوارہ روڑی صاحب ایمن آباد ضلع گوجرانوالہ :۔ گوروجی نے اس مقام پر پتھروں اور کنکریوں پر بیٹھ کر خدا کی عبادت کی تھی۔

(۷) گوردوارہ نانک صاحب ہڑپہ :۔ سکھوں کی روایت کے مطابق گوروجی نے اس مقام پر سرکاری افسروں کو عوام کے ساتھ انصاف کا برتاؤ کرنے کی تلقین کی تھی۔

(۸) گوردوارہ نانک صاحب دیپالپور :۔ سکھوں کی روایت کے مطابق گوروجی نے بیماریِ جذام میں مبتلا ایک مسلمان درویش کے پاس رات بسر کی تھی۔

(۹) گوردوارہ پنجہ صاحب :۔ یہ گوردوارہ سکھوں کے عہدِ حکومت میں ہری سنگھ نلوا نے تعمیر کروایا تھا۔ یہاں ایک بہت بڑے پتھر پر پنجہ کا ایک نشان ہے، جسے گوروجی کے پنجہ کا نشان تصور کیا جاتا ہے۔

گورو نانک جی مہاراج کے پانچسو سالہ جشنِ ولادت کے سلسلے میں متروکہ اوقاف بورڈ نے تمام اہم گوردواروں کی مرمت و تزئین پر لاکھوں روپے خرچ کئے ہیں۔ اس کے سبب ان کی شان اور عظمت دوبالا ہو گئی ہے۔ سکھ زائرین کی سہولت کے لیے بورڈ نے مناسب انتظامات کئے ہیں۔ یہ زائرین جو ہندوستان۔ ایران۔ افغانستان برطانیہ۔ ملائشیا۔ نیروبی۔ ہانگ کانگ اور دیگر ممالک سے ہزاروں کی تعداد میں آ رہے ہیں ان گوردواروں کی موجودہ حالت کو دیکھ کر یقیناً مطمئن ہوں گے اور انھیں خود یہ اندازہ ہو جائیگا کہ حکومت پاکستان ان کی دیکھ بھال کے لیے کیا کچھ کر رہی ہے ؛

نظامِ حکومت پر ایک اعتراض

یہ مسلّمہ امر ہے کہ اسلام کا نظامِ حکومت جمہوری ہے۔ جمہوریت میں عدل و انصاف کے جو معنی پنہاں ہیں سلاطین اسلام کی پر ابد ان پر نگاہ رہی۔ حتیٰ کہ بڑے سے بڑے دشمنوں کو بھی اس میں کوئی کلام نہیں کہ مسلمان بادشاہ سب کے سب عادل و منصف تھے اور اس معاملے میں دنیا کی کوئی قوم مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ مگر یہ کہ اسلام کا مزاج بادشاہی نہیں جمہوری ہے۔ پھر مسلمان بادشاہ کیوں بادشاہی کرتے رہے انہوں نے ہندوستان میں جمہوریت کی ترویج و اشاعت کیوں نہیں کی یہ سوال سلاطین ہند کے لیے بالعموم اور اسلامی ہند کے آخری باجبروت شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیرؒ کے لیے بالخصوص ان اذہان میں ضرور پیدا ہوتا ہے جو اسلام کے نظریۂ حیات اور نظام حکومت پر یقین رکھتے ہیں۔

اس اہم سوال کا جواب دینے کے لیے ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ مسلمان حکمرانوں کے سامنے وہ کیا شے تھی جس کے پیش نظر انہوں نے جمہوریت کے بجائے بادشاہت کا راستہ اختیار کیا۔

در اصل چالاک و عیّار برہمنوں نے اپنے اقتدار اور اختیار کو مضبوط اور مستحکم بنانے کے لیے تمام نسلِ انسانی کو ہندوستان میں جن چار درجوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ اس نے مساواتِ انسانی کی راہوں کو بالکل مسدود کر دیا اور جمہوریت چونکہ مساوات کی بنیاد پر قائم ہوتی

ہے۔ لہذا جب انسانی مساوات کی بجائے ذات پات اور اس کی اونچ نیچ معاشرے پر حاوی اور غالب آگئی تو جمہوریت کا تصور کیونکر پیدا ہو سکتا تھا اور جمہوریت کیسے قائم ہو سکتی تھی لہذا ہم اب یہ کہہ سکتے ہیں کہ بادشاہت کا قیام ہندوستان کی سیاست کا عین تقاضا تھا۔ جس کی ہندوؤں کے اس معاشرتی نظام نے بھرپور تائید کی جس کی بنیاد نسل انسانی کی چار ذاتوں پر تھی۔

عیار برہمنوں نے نسل انسانی کو علی الترتیب جن چار ذاتوں میں درجہ بدرجہ تقسیم کیا وہ یہ ہیں۔

اوّل برہمن دوم کشتری سوم ویش چہارم شودر

یہ برہمنوں کا دعویٰ ہے کہ وہ برہما (خدا) کے منہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ کشتری کا درجہ برہمن کے بعد آتا ہے۔ کیونکہ وہ برہما کے بازوؤں سے پیدا ہوئے ہیں۔ اس لئے ان کا کام تلوار چلانا، ملک کی حفاظت کرنا ہے۔ ویش کا درجہ کشتری کے بعد آتا ہے کیونکہ وہ برہما کی رانوں سے پیدا ہوئے ہیں۔ اس لیے ان کا کام یہ ہے کہ غلّہ اگائیں ملک کے لیے خوراک کا بندوبست کرنا انہی کا کام ہے۔ شودر کا درجہ ان تینوں کے بعد آتا ہے کیونکہ یہ لوگ برہما کے پاؤں سے پیدا ہوئے ہیں۔ لہذا شودروں کا یہی کام ہے کہ وہ برہمن، کشتری، اور ویش ہی کی خدمت کرتا رہے۔ انہی سے اپنی روزی حاصل کرے۔ ہندوؤں کی ایک مقدّس کتاب منوسمرتی میں لکھا ہے

شودر کو محض برہمن کی غلامی کے لیے پیدا کیا گیا ہے ۔ شودر کو اگر آزاد بھی کر دیا جائے تو بھی وہ غلامی سے رہائی نہیں پا سکتا، کیونکہ یہ غلامی اس کی فطرت میں داخل ہے ۔

انسان کا چار ذاتوں میں تقسیم ہو جانا پھر چار ذاتوں کا ایک دوسرے کی امداد کا محتاج رہنا ایسی خرابی تھا جس کے باعث کوئی جماعت اور گروہ اس لائق نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ سیاسی قوت حاصل کر سکے اور اپنے زور سے پھر کسی کو بادشاہت سے ہٹا دے اور دوسرے کو اس کی جگہ پر بادشاہ بنا کر بٹھا دے اور یہ کہ باقی تینوں ذاتوں کو اپنا تابع بنا لے ۔

ذات پات کے اس غیر انسانی اصول اور ضابطے کی وجہ سے انسان ایک ایسے معاشرے میں تقسیم ہو گیا جس سے وہ ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہنے پر مجبور ہو گیا ۔ ظاہر ہے ذات پات ہی وہ پہلا اور آخری ایسا حربہ تھا جس نے جمہوریت کے قیام اور اس کی ترقی کو ناممکن بنا دیا اور بادشاہت کی ضرورت از بس لازمی ہو گئی ۔

انسان کو ذات پات میں تقسیم کر دینا جو برہمنوں کا اپنے سیاسی اقتدار اور اختیار کو مضبوط اور مستحکم بنانے کی ایک چال تھی ۔ مذہب بن گیا اور یہی مذہب پھر جمہوریت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بن گیا ۔ اور ہندوؤں کا یہ عقیدہ ہو گیا کہ ذات پات کے لحاظ سے جو شخص جس ذات

یا فرقے میں پیدا ہو گیا وہ مرتے دم تک اسی میں رہے گا۔ اس سے باہر کبھی نہیں نکل سکے گا۔ یہ عقیدہ رفتہ رفتہ اس قدر سخت اور ناقابلِ ترمیم دستورِ حکومت کی حیثیت اختیار کر گیا کہ بادشاہت کے سوا کوئی اور طریقہ یا راستہ حکومت کرنے کا باقی نہ رہا۔

منوجی مہاراج جو ایک ہندو قانون ساز ہیں۔ جن کا دھرم شاستر ہندوؤں کی ایک الہامی کتاب وید کی تفسیر ہے بادشاہت کے بارے میں کہتے ہیں۔ بادشاہ کا خمیر دنیا کے محافظ عناصرِ ہشت گانہ سے تیار کیا جاتا ہے۔ اس لیے بلحاظِ نورانیت وہ تمام مخلوق میں ممتاز ہوتا ہے۔ وہ انسانی صورت میں ایک بہت بڑا دیوتا ہوتا ہے۔ بھیشم کے خیال میں بادشاہ وشنو بھگوان کی روح اپنے اندر جذب کر لیتا ہے یہی سبب ہے کہ تمام دنیا ایک انسان کے سامنے اس طرح سر تسلیم خم کرتی ہے جس طرح کسی دیوتا کے سامنے۔ کوتیلیا کی رائے کے مطابق بادشاہ اندر دیوتا اور یم دیوتا کے ہم مرتبہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا بادشاہ کی تحقیر نہیں کرنی چاہیئے۔

سیاستدانوں اور قانون دانوں نے اپنے عہد میں بادشاہت کو صرف اہم اور اعلیٰ ترین منصب ہی نہیں بنایا بلکہ ان حالات سے مجبور ہو کر جن میں وہ اپنی زندگی بسر کر رہے تھے اس میں انتہائی تقدیس و تکریم کے عنصر کو بھی شامل کر دیا۔ اب اس اہم سوال کا جواب کہ دنیا کے تمام مذاہب میں اگر اسلام ہی وہ پہلا دین ہے جس نے اہلِ دنیا کو پہلی بار جمہوریت سے روشناس کرایا اور دنیا میں جمہوری طرزِ حکومت کی بنیاد رکھی تو کیا وجہ ہے کہ اسلام کے نام لیواؤں خاص کر

ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں نے جمہوری حکومت قائم نہیں کی۔ اس سوال کا مختصراً جواب یہ ہے کہ ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں قوموں ہی کے عہدِ حکومت میں مملکت کا نظریہ بادشاہت پر مبنی تھا۔ ان کے خیال کے مطابق بادشاہ کی ذات ہی سیاست کے تمام افکار اور مملکت کے فرائض کا محور متصوّر ہوتی تھی۔ سیاسی مفکرین کی تصانیف میں بھی اوّل سے آخر تک بادشاہت ہی کی ضرورت اور اس کی اہمیت کا ذکر ہے۔ جیسا کہ مہابھارت اور شانتی پروَن کے بیانات سے واضح ہے یا منو اور کوٹلیا کے خیالات سے عیاں ہے۔ کہ امن و امان کے قیام کی شدید ضرورت ہی سے مملکت کی تشکیل اور بادشاہت کی موجودگی کا تقاضا پیدا ہوتا ہے۔ انسانی معاشرے کو طوائف الملوکی سے بچانے کے لیے بادشاہت ازبس لازمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پرانے زمانے میں وہ لوگ بالکل تباہ و برباد ہو جاتے تھے۔ جن کا کوئی بادشاہ نہ ہوتا تھا۔ وہ لوگ ایک دوسرے کو اس طرح نگل جاتے تھے جس طرح بڑی مچھلیاں چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کو نگل جاتی ہیں۔

مہابھارت میں ہے جس طرح آفتاب و ماہتاب کے طلوع نہ ہونے سے دنیا پر گہری تاریکی چھا جاتی ہے جس طرح مچھلیاں تھوڑے پانی میں اور چڑیاں محفوظ جگہ کے لیے ایک دوسرے سے لڑ لڑ کر تباہ و برباد ہو جاتی ہیں اسی طرح لوگ بادشاہ کے بغیر تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔

مسلمان "قانون دانوں یعنی فقیہوں نے بھی پھر کچھ ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے جن سے بادشاہت کا جواز مہیّا ہوتا ہے۔ چنانچہ

ابوالفضل کی رائے ہے کہ اگر دنیا میں بادشاہ کا وجود نہ ہوتا تو فتنہ و فساد سے کبھی نجات حاصل نہ ہوتی اور نہ خودغرضی کا قلع قمع ہوتا۔ لافانونیت اور نفسانیت سے مغلوب ہو کر نوع انسانی قعر ہلاکت میں گر جاتی اور دنیا سے فارغ البالی رخصت ہو جاتی اور تمام کرۂ ارض ایک دشتِ بے آب و گیاہ بن کر رہ جاتا۔ لہٰذا سب سے پہلے انسان کے لیے بادشاہ کی ضرورت ہے پھر بیوی کی اور اس کے بعد دولت کی۔ کیونکہ ملک میں جب تک بادشاہ نہ ہو انسان اپنی بیوی اور دولت سے لطف نہیں اٹھا سکتا۔ (آئینِ اکبری)

فقہائے اسلام نے بادشاہت کے جواز میں جو دلائل پیش کیے ہیں ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ ملک میں امن و امان اور معاشرے میں ضبط و انقیاد کے قیام میں انسان کی خودغرضی بغاوت اور سرکشی خاص طور سے رکاوٹیں پیدا کرتی ہے۔ ادنیٰ اوصاف، رزائل اخلاق مثال کے طور سے ظلم و ستم جبر و تشدد اور بے انصافی انسان کی فطرت کا حصّہ بن چکی ہیں لہٰذا اللہ تعالےٰ کا حکم ہے کہ لوگوں میں ایک عادل حاکم ہونا چاہیئے جو بنی آدم کے اعمال اور اہل علم کے احوال کی رہنمائی کرے، اور انہیں ہر بلا اور مصیبت سے مامون و محفوظ رکھے۔ (حوالے کے لیے دیکھیئے سیاست نامہ)

حاکم عادل کا فرض ہے کہ وہ طاقتور لوگوں کو کمزور آدمیوں پر ظلم و ستم ڈھانے سے روکے۔ شر انگیز اور ایذا رسانی اور بغاوت و سرکشی کا دروازہ ایک بادشاہ ہی بند کر سکتا ہے۔ اللہ تعالےٰ کے حکم سے لوگوں کے دلوں میں اس کا خوف بیٹھ جاتا ہے۔ تاکہ وہ اس عدل و انصاف کے زیر سایہ

امن و سکون کے ساتھ اپنی زندگی بسر کر سکیں

بادشاہ کے عدل و انصاف کی بدولت بعض لوگ بخوشی اطاعت کی شاہراہ اختیار کرتے ہیں بعض لوگ شاہی سیاست سے مرعوب ہو کر ظلم و ستم سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ اور ضرورت سے مجبور ہو کر سیدھی راہ پر چلنے لگتے ہیں۔

اورنگ زیب عالمگیرؒ کے پدر گرامی قدر شہنشاہ شہاب الدین شاہجہاں کے نزدیک بادشاہت کا مفہوم یہ تھا کہ خالق کائنات کی دولت و امانت یعنی رعیت کو آرام کی زندگی بسر کرنے کے لائق بنایا جائے۔ بادشاہ کی جوانمردی کمزوروں کی فلاح و بہبود اور اللہ تعالیٰ کی پرستش کرنے والوں کی حمایت میں صرف ہونی چاہیئے (حوالے کے لئے دیکھئے سیاست نامہ آئین اکبری۔ ذخیرۃ الملوک۔ اکبر نامہ)

دولفظی بات یہ کہ حکمران قوم اور محکوم قوم یعنی مسلمان اور ہندو دونوں بادشاہت کے قائل تھے اس لیے اسلامی ہندوستان میں جمہوری حکومت کی بجائے بادشاہی طرزِ حکومت ہی وقت کا تقاضا تھا۔ جسے عدل و انصاف کے ساتھ مسلمان بادشاہوں نے امتیازی حیثیت سے بخوبی پورا کیا۔

درحقیقت بادشاہ نام ہے ایک ایسے مطلق العنان حکمران کا، جس کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ قانون کا درجہ رکھتا ہے۔ سب لوگ اس کے پابند رہیں کہ وہ اس کی اطاعت اور اتباع کریں مگر وہ خود کسی قاعدے قانون کا پابند نہیں۔ ان معنوں میں دنیا کے کسی حصے میں مسلمانوں کی کبھی کوئی

بادشاہت قائم نہیں ہوئی اور نہ کوئی مسلمان بادشاہ ایسا گزرا ہے جو اپنے آپ کو قانون سے آزاد اور بالاتر سمجھتا ہو۔ مختصراً یہ کہ مسلمان بادشاہوں کے ہر دور میں معدلت گستری کی بہترین مثالیں مل جاتی ہیں اور ہر زمانے میں اسلام ہی کا قانون رائج تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اورنگ زیب کے پردادا شہنشاہ اکبر کے زمانے میں اسلامی قانون سے متعلق بعض مثالیں ملتی ہیں جن پر عمل نہیں کیا گیا۔ مگر ایک تو یہ کہ وہ تھوڑی سی ہیں دوسرے یہ کہ اس کا دائرہ عمل بہت محدود رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ اکبر کے دور میں بھی اسلام ہی کا نظام عدل گستری قائم رہا۔ صرف مقدماتِ فوجداری میں بعض سزائیں ایسی ہیں جو اسلامی قانون کے مطابق نہیں کہی جاتیں۔

یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب اورنگ زیبؒ سریرآرائے سلطنت ہوا تو اس نے سوچا کہ اب ان اسلامی روایات کی تجدید ہونی چاہیئے جو کسی وجہ سے قبل ازیں قائم نہ ہو سکیں۔ چنانچہ ہندوؤں پر جزیہ دوبارہ لگا دیا اور نئے مندر بنانے پر بھی پابندی لگا دی۔ مگر پرانے مندروں کے لیے اس نے اعانت کے طور سے جاگیریں منظور کر دیں تاکہ غیر مسلموں کو اپنے مذہبی رسوم و ظواہر کے سلسلے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔

نئے مندروں کی تعمیر پر اورنگ زیب عالمگیر نے جو پابندی لگائی تھی وہ ظاہر ہے کہ مذہبی تعصب سے نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ پرانے مندروں کی مالی امداد کیوں منظور کرتا یہ صرف شاہی خزانے کو مزید بوجھ سے

بچانے کے لیے ایک اقدام تھا۔ مگر مرہٹوں اور اورنگ زیب کے درمیان جو معرکہ آرائیاں ہوئیں ہندو یہ بھول گئے کہ اورنگ زیب غیر مسلموں سے کس درجہ رواداری رکھتا اور حسن سلوک سے پیش آتا تھا۔ محض اسلام اور مسلمان دشمنی کے جذبے سے انہوں نے ان لڑائیوں کو سیاسی کی بجائے مذہبی رنگ دیدیا اور یہی وہ بنیاد ہے جسے آگے چل کر انگریز اور ہندو مؤرخوں دونوں نے مل کر جہاں اور بہت سے مسلمان بادشاہوں پر گندگی پھینکی ہے، کیچڑ اچھالا ہے وہاں اورنگ زیب عالمگیر کو بھی خوب مطعون کیا ہے اور نئی نسل میں اسے ایک جابر و قاہر اور بے حد متعصب حکمران کے طور سے پیش کیا ہے۔ حالانکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ ہندو اور انگریز مؤرخوں نے صرف یہی نہیں کہ اورنگ زیب پر فاحش سخت نکتہ چینی کی ہے بلکہ اپنے خبث باطن سے لگے ہاتھ اسلام کو بھی ہدفِ تنقید بنایا ہے۔

اورنگ زیب عالمگیرؒ کے مخالفوں نے اس کے خلاف جو فرد جرم تیار کی ہے وہ بڑی طویل ہے۔ وہ سب یہی کہتے ہیں کہ اس نے اپنی قلمرو میں ہندوؤں کے مندر ڈھا دیئے۔ جس سے ہندو ناراض ہو گئے اس نے مرہٹوں کے خلاف دکن میں ایک طویل جنگ کا سلسلہ شروع کیا جس سے مغلیہ سلطنت کے وسائل اور وقار کو سخت نقصان پہنچا۔

ہم مسلمانوں کے لیئے سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ نئے زمانے میں تاریخ نویسی کی جو روایات قائم ہوئیں، ہندو

اور انگریز مؤرخوں نے جو کچھ لکھ دیا، جن خیالات کو پیش کر دیا ہم نے انہی معلومات کا منبع سمجھ کر قبول کر لیا ہے اور انہی کے طرزِ نگارش کو ایک معیار بنا لیا ہے۔ اور یہی شے اُن تمام خرابیوں کی جڑ ہے جو آج سلاطین اسلام کے باب میں ہماری نئی نسل کے سامنے ہے۔

اورنگزیب عالمگیر کے زمانے کے مؤرخوں میں جادو ناتھ سرکار اور مغربی مفکّر لین پول کے نام سرفہرست ہیں۔ ان لوگوں نے اصل مآخذ سے جو فارسی میں ہیں فائدہ اٹھایا ہے۔ ان دونوں مؤرخوں نے اورنگزیب عالمگیر کی بعض خصوصیّات اور ذاتی صفات کی بڑی تعریف کی ہے۔ اس کی ذہانت، فہم و فراست، صداقت، شجاعت اور علمی فضیلت کے علاوہ اس کی دینداری اور تقویٰ کا بھی کھُلے بندوں اعتراف کیا ہے۔

مگر با ایں ہمہ لین پول نے معذرت کو شانہ اور دھیمے لہجے میں اور جادو ناتھ سرکار نے متعصبانہ اور معاندانہ انداز میں اورنگ زیب عالمگیر پر سخت تنقید بھی کی ہے۔ اور اپنی کتاب اسلامی کلیسائی ریاست ہندوستان (THE ISLAMIC STATE CHURCH IN INDIA) میں لکھا ہے: "اسلامی ریاست اصولی طور سے ایک تھیا کریسی ہے جس میں تمام وسائل اور تمام قوتیں حکومت اور سیاسی اقتدار کے تحت دین حق کی تبلیغی مہم کے

وقف ہوتی ہیں۔ اس لیئے اسلام کے علاوہ کسی دوسرے مذہب کو باقی رہنے کا حق دینا گناہ کے مترادف ہے۔ اسلام کی فتح کے بعد جو لوگ لڑائی میں شریک تھے انہیں قتل کرنا یا غلام بنانا ضروری ہے۔ جو لوگ جنگ میں شریک نہیں ہوتے تھے اگر انہیں قتل نہ کیا جائے تو انہیں یہ ترغیب دی جاتی کہ اسلام قبول کرلیں غرضیکہ تمام لوگوں کو مسلمان بنانا اور ہر طرح کے اختلاف کو کچل دینا اسلامی ریاست کا نصب العین ہے۔"

جادو ناتھ سرکار نے اور نہ جانے کتنے ہی ایسے الزامات اورنگ زیب عالمگیر پر لگائے ہیں جو بالکل بے بنیاد ہیں۔ اسی طرح کا ایک بے سروپا الزام جسے مولوی محبوب عالم مرحوم نے اپنی کتاب "تلوار اور اسلام" میں بیان کیا ہے، یہ بھی تھا کہ اورنگزیب عالمگیر ہر صبح جب تک ایک من یا سوا من ہندوؤں اور برہمنوں کی زنّار (جینو) گلے سے اُتروا کر تڑوا نہ لیتا صبح کا کھانا ہرگز نہ کھاتا۔ محبوب عالم مرحوم اس لغو داستان پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں "بالفرض اگر ایک زنّار کا وزن دس رتی مان لیا جائے تو ایک من زنّار کا مطلب یہ ہوا کہ ۱ سے ۳۰،۷۲۰ اشخاص کے گلے سے اتروایا گیا اور سوا من ۳۸۴۰۰ اشخاص کے گلے سے اگر ۳۸۴۰۰ ہندو روزانہ مسلمان کیئے جاتے تھے تو اورنگزیب عالمگیر کی پچاس برس کی طویل سلطنت میں ۷۰، کروڑ ہندوؤں کا مسلمان ہونا لازم آتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی سوچیئے

کہ روزانہ اگر سوا من جنیو توڑے جاتے اور جنیو کا کم سے کم دس رتی وزن مان لیا جائے تو اس حساب سے ۲۸۸۰۰ ہندوؤں سے روزانہ سابقہ پڑتا۔ اس طرح سے ہندوستان کے تمام ہی ہندو ختم ہو جاتے مگر ایسا نہیں ہوا۔ جس سے معلوم ہوا کہ یہ روایت ہی سرے سے بے بنیاد اور لغو ہے۔

پروفیسر جادو ناتھ سرکار کے نزدیک اورنگزیب عالمگیر کا سب سے بڑا جرم یہ تھا کہ وہ ہندوستان کو ایک اسلامی ریاست بنانا چاہتا تھا۔ بقول سرکار کے ہندوؤں پر دوبارہ جزیہ لگانا اور ان کے مندروں کا گرائے جانا اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ سرکار کے خیال میں اورنگزیب ایک نااہل اور متعصب حکمران تھا۔ حالانکہ حقیقت اس کے خلاف ہے۔

یہ بات اورنگزیب عالمگیر کی حکمت عملی کے یکسر خلاف تھی کہ ہندوؤں کے مندر گرائے جائیں بحیثیت ایک عادل اور باجبروت حکمران کے اورنگزیب عالمگیر نے اپنے جو فرمان جاری کیئے وہ تاریخ کی بیشتر کتابوں میں آج بھی محفوظ ہیں جن سے یہ پتہ چل سکتا ہے کہ اُس نے اپنے عہدِ حکومت میں بہت سے مندروں کو بڑی بڑی جائیدادیں عطا کیں۔

جزیّے کے باب میں ہم یہاں صرف اتنا کہیں گے کہ ہر چند اورنگزیب عالمگیر نے ہندوؤں پر جزیہ دوبارہ عاید کیا تاہم اسی ذیل میں اور بہت سے ٹیکس بھی تو ختم کر دیئے تھے۔ لہٰذا جزیے سے متعلق ہندوؤں نے جو کچھ لکھا ہے وہ تعصب پر مبنی ہے۔

یہ کہنا کہ یہ ایک ٹول ٹیکس تھا جس کا ادا کرنا ہر ہندو پر لازم تھا سراسر غلط بات ہے۔ چودہ برس تک کے تمام ہندو لڑکے اور لڑکیاں جزیے سے مستثنیٰ تھیں۔ اندھوں، معذوروں اور پاگلوں سے بھی جزیہ نہیں لیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ مندروں کے پجاری بھی جزیے سے مستثنیٰ تھے۔ البتہ ایسے پجاریوں کو ضروری جزیہ دینا پڑتا تھا جن کے پاس وقف وغیرہ کی کثیر آمدنی ہوتی تھی۔ سرکاری ملازمین سے چاہے وہ کسی محکمے سے تعلق رکھتے ہوں جزیہ نہیں لیا جاتا تھا۔

جزیہ صرف ایسے ہی کھاتے کماتے ہندوؤں وغیرہ سے لیا جاتا تھا جو تندرست اور جوان ہوتے تھے۔ اگر ہم ایک کنبے کو اوسطاً چھ افراد پر مشتمل فرض کرلیں تو اس لحاظ سے غیر مسلم آبادی کے چھٹے حصے پر جزیے کا ادا کرنا لازم آتا ہے۔ اور اگر اس میں معذور اور بیروزگار افراد اور سرکاری ملازمین کی تعداد کو منفی کر دیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہر سو افراد میں صرف بارہ تیرہ افراد جزیہ دیتے تھے۔ یہ گویا آبادی کا کُل آٹھواں حصہ شمار ہوتا ہے۔ پھر یہ کہ جزیہ کی رقم بھی کچھ زیادہ نہ ہوتی تھی۔ ایک امیر کبیر آدمی کو سال میں زیادہ سے زیادہ تیرہ روپے چار آنے ادا کرنے پڑتے تھے۔ بخلاف اس کے مسلمانوں کو اپنی محفوظ آمدنی میں سے ڈھائی فی صد رقم زکوٰۃ میں ادا کرنی پڑتی تھی جو ظاہر ہے جزیے کی رقم کے مقابلے میں بہت زیادہ ہوتی تھی۔ یہ حقائق اس بات کا کھلا ثبوت ہیں کہ اورنگزیب عالمگیر کی حکومت کی حکمت عملی صرف اسلامی روایات پر قائم تھی کسی تعصب اور

تنگ نظری پر نہیں۔

یہ بات خاص طور سے ذہن میں رہنی چاہیئے کہ معاشرے اور نظم حکومت کے بارے میں اورنگزیب عالمگیر جو تصور اور خیال رکھتا تھا اس کی اساس شریعت اسلام ہی کے اصول تھے جنہیں وہ عملی شکل دینے میں تمام عمر کوشاں رہا۔

معاشرے کی اصلاح کے سلسلے میں اورنگزیب عالمگیر کا ہندوؤں کی رسم ستی کے خلاف حکم دینا اور اسے موقوف کرنا اس کی حکومت کا ایک اہم قدم ہے۔ راہداری کو جو کھانے پینے کی چیزوں پر دس فیصد ٹیکس تھا اُس نے ختم کر دیا۔ اس سے بہ نسبت مسلمانوں کے ہندوؤں کو زیادہ فائدہ پہنچا۔ اس کے علاوہ ابواب کو بھی جو اسی قسم کے محصولات تھے، معاف کر دیئے۔ علاوہ ازیں بعض ایسے ٹیکس بھی موقوف کر دیئے جو صرف ہندوؤں ہی کو دینے پڑتے تھے۔ مثلاً ہر وہ ہندو جو کسی مقدس مقام پر غسل کرتا تھا سوا چھ روپے معاوضہ ادا کرتا تھا۔ اسی طرح ہر اس ہندو لاش پر بھی ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا جسے گنگا میں بہایا جاتا تھا۔ اس سے یہ بات قطعی طور سے غلط ثابت ہو جاتی ہے کہ اورنگزیب عالمگیر کو اپنی ہندو رعیت سے تعصب تھا اور وہ اس کے آرام و آسائش کا خیال نہیں رکھتا تھا۔

اورنگزیب عالمگیر کی خواہش یہ تھی کہ معاشرہ پورے طور اسلامی سانچے میں ڈھل جائے۔ چنانچہ بھنگ کی کاشت کی سارے ملک میں ممانعت کرنا، طوائفوں کو شادیاں کر لینے پر مجبور کرنا، شراب پینے، جوا کھیلنے

اور زنا کرنے کو قانون کی نگاہ میں سنگین جرم قرار دینا اسی مقصد کو حاصل کر لینے کے لیئے تھا۔

اپنے دربار سے ناچ گانے کی محفلوں کو خارج کرنا، بادشاہ کو تو لنے کی رسم کو ختم کرنا اور نوروز کے جشن کو موقوف کرنا یہ سارے اقدامات اسی مقصد کے تحت اُٹھائے گئے کہ اس کے دور کا معاشرہ قطعی طور سے اسلامی ہو جائے۔

ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس مقصد کے لیئے اورنگزیب عالمگیر بعض اوقات اپنی اصلاحات میں حد سے بڑھ جاتا تھا اور تنگ نظر علماء کے مشوروں کو قبول کر لیتا تھا جیسا کہ سرمد کے معاملے میں اس سے ایسا ہوا۔ صرف ننگا رہنے کے جرم میں علماء کے فتوے پر سرمد کو قتل کروایا گیا۔ حالانکہ سرمد اگر اپنے طرزِ عمل کو تبدیل کرنے پر تیار نہیں تھے تو انہیں معاشرے سے علیحدہ رکھا جا سکتا تھا۔ ہر چند یہ متشدّد رویّہ اورنگزیب عالمگیر کی طرف سے روا رکھا گیا تاہم یہ ہر گز نہیں کہا جا سکتا کہ وہ متعصب اور تنگ نظر تھا۔

اورنگزیب عالمگیر کا سب سے بڑا بھائی دارا شکوہ اگر ہندوستان کے تخت و تاج کا مالک بن جاتا تو وہ یقیناً اکبر اعظم کے دین الٰہی کو زندہ کرتا جس سے ہندوستان کے اکثر لوگ نہ ہندو رہتے نہ مسلمان خاص کر مسلمانوں کے لیئے تو دین الٰہی سم قاتل ثابت ہوتا۔ غرض دارا شکوہ کے ملحدانہ خیالات جو اس کی تصانیف سے ظاہر ہوتے ہیں اسے ہندوستان

کا اکبر ثانی ثابت کرتے جس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے وجود کو مٹا کر ہندوستان کی متحدہ قومیت پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ مگر شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کی مجاہدانہ للکار نے اسے ناکام بنا دیا۔

اورنگزیب عالمگیر کا حقیقت میں یہی سب سے بڑا زریں کارنامہ ہے کہ اُس نے دارا شکوہ کو شکست دے کر حکومت پر تسلط جمایا اور اپنی اصلاحات جاری کر کے اکبر کے فتنہ دینِ الٰہی کو از سر نو زندہ کئے جانے کے تمام امکانات کو یکسر مٹا دیا۔

دراصل ہندوؤں نے بعض واقعات کو مذہبی رنگ دے کر جو اورنگ زیب عالمگیر کے خلاف ہرزہ سرائی اور غوغا آرائی کی ہے اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس کے عہد معدلت گستر میں وہ ہندو نوازی نہیں ہو سکی جس کی ہندوؤں کو دارا شکوہ سے توقع تھی یا جس کی دارا شکوہ نے مثالیں پیش کی تھی، جس کا کوئی جواز نہ تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اورنگزیب عالمگیر مذہب کو بڑی اہمیت دیتا تھا وہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھا مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ غیر مذاہب سے تعصب رکھتا اور ان کے معاملات میں مداخلت کرتا تھا۔ اُس نے صرف انہی ہندوانہ رسموں کو مٹانے اور ان کی اصلاح کرنے کی کوشش کی جن سے معاشرے میں خرابیاں پیدا ہوتی تھیں بداخلاقی اور بدکرداری کو راہ پانے کا موقع ملتا تھا۔ مگر باایں ہمہ جس

انداز سے اصلاح کی کوشش کی گئی اُس میں جبر و تشدّد کی کوئی صورت پیدا نہیں ہونے دی گئی۔ مثلاً ستی کی رسم کے خلاف اورنگزیب عالمگیر کے عہد میں جو طرزِ عمل اختیار کیا گیا ایک فرانسیسی سیاح ڈاکٹر برنیر نے اپنے بارہ سالہ روزنامچے میں اس انسانیت سوز کام کی روک تھام کا خاکہ اس طرح پیش کیا ہے، وہ لکھتا ہے:۔

"آج کل پہلے کی بہ نسبت ستی کی تعداد بہت کم ہو گئی ہے۔ کیونکہ مسلمان جو اس ملک کے حکمران ہیں اس وحشیانہ رسم کو مٹانے کی جہاں تک ہو سکتا ہے، کوشش کرتے ہیں۔ اگرچہ اس کی ممانعت کے سلسلے میں کوئی قانون وضع نہیں کیا گیا کیونکہ یہ بات ان کی، حکمت عملی کے خلاف ہے کہ وہ کسی مذہبی رسم میں دست اندازی کریں ان کے یہاں مذہبی مراسم کے ادا کرنے کی مکمل آزادی ہے تاہم ستی کی رسم کو (جو ہندوؤں کے مذہب میں داخل ہے) بعض رکاوٹیں پیدا کر کے مٹانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ کوئی عورت اپنے صوبے کے حاکم کی اجازت کے بغیر ستی نہیں ہو سکتی اور صوبے کا حاکم (گورنر) اُس وقت تک ستی ہونے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا کہ جب تک اسے اس بات کا پورا یقین نہ ہو جائے کہ وہ اپنے ارادے سے ہرگز باز نہیں آئے گی۔ کبھی تو وہ ایسا کرتا ہے کہ ستی ہونے کی خواہش مند عورت کو محل سرا میں بھیج دیتا ہے۔ تاکہ بیگمات بھی اسے اپنے طور سے راہ راست پر لانے کی کوشش کریں اور سمجھا بجھا کر اس

کو ستی ہونے سے روکیں۔

ستی کی رسم کو مٹانے کی تمام کوششوں میں یہ بات سرفہرست نظر آتی ہے کہ اورنگزیب عالمگیر کی طرف سے ملک کے تمام صوبوں کے حاکموں کو واضح طور پر یہ ہدایت کی گئی تھی کہ وہ ستی پر آمادہ ہونے والی عورت اور اس کے رشتے داروں کو حتی المقدور یہ بتائیں اور سمجھائیں کہ زندگی ایک انمول نعمت ہے اسے یوں ضائع نہیں کرنا چاہیئے۔ ایسا کرنا حقیقت میں زندگی سے فرار اور خودکشی ہے۔

اگر اورنگ زیب عالمگیر کے عہد حکومت کا ایک ناقدانہ تاریخی جائزہ لیا جائے اور یہ معلوم کرنے کی سعی کی جائے کہ اس کی حکمتِ عملی کا وہ کونسا گوشہ ایسا ہے جس کے پیش نظر مؤرخوں میں اس کے خلاف اتنا تعصب پیدا ہوا تو جملہ اعتراضات کا تجزیہ کرنے کے بعد پتہ چلے گا کہ تنگ نظر اور متعصب مؤرخوں نے اسے اس کے اسی کارنامے کے سبب ناپسند کیا ہے جو ایک حقیقت پسند نقّاد کے نزدیک اس کی سب سے بڑی اور نمایاں خدمت ہے۔

درحقیقت اسلامی ہندوستان کا معاشرہ دوسرے معاشروں کی طرح اندرونی اور بیرونی حملوں کے صدمات سے محفوظ نہ رہ سکا۔ اگرچہ اسے اور بہت سے حملوں کے صدمات سے بھی دوچار ہونا پڑا تاہم اکبر اعظم کے دین الٰہی کے حملے کا صدمہ سب سے بڑا جاں گسل اندرونی صدمہ ثابت ہوا۔ معاشرے میں اس کی وجہ سے جو رخنے پیدا ہو گئے تھے انہوں نے ایک مستقل حقیقت اختیار کر لی تھی۔

دراصل اسی حملے کو رد کرنے اور اس کے اثرات کو مٹانے کے لیے علمائے اسلام

عبدالحق محدث دہلوی اور شیخ احمد سرہندی المعروف مجدد الف ثانی نے جو تحریک چلائی تھی اورنگ زیب عالمگیر اس کا نہایت سرگرم کارکن تھا۔ اگر وہ بادشاہ نہ ہوتا تو وہ بھی اس تحریک کو آگے بڑھانے کے لیے وہی طریقہ اختیار کرتا جو عمومی ہوتا ہے۔ مگر وہ چونکہ ایک بادشاہ تھا اس لیے اس نے اپنے فرائض منصبی کو اس طرح سے انجام دیا کہ ایک طرف تو اس سے بادشاہت کے شرائط پورے ہوتے رہے دوسری طرف وہ ایک مصلح کا کردار بھی انجام دیتا رہا۔

اورنگزیب کی حکومت کی حکمتِ عملی کے باب میں یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ اس کی بنیاد ہرگز تعصب اور تنگ نظری پر قائم نہیں تھی بلکہ ان روایات اور اصولوں پر تھی جن پر عمل کرنا اس کے لیے بہت ضروری تھا۔ وہ روایات اور اصول اسلام کی شریعت سے متعلق تھے جس کے بنیادی احکام کو نافذ کرنا لازم تھا۔ یہ احکام صرف غیر مسلموں تک ہی محدود نہ تھے بلکہ ان میں سے اکثر احکام کا تعلق مسلمانوں کی زندگی سے تھا جن پر محکمہ احتساب سختی سے عمل کرتا تھا۔

جو لوگ اورنگ زیب عالمگیر کی اصلاحات کو نگاہوں کے سامنے رکھتے ہوئے اسے ایک متعصب اور تنگ نظر حکمران ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ حقیقت میں اس کی اصلاحات کا مطالعہ بغور نہیں کرتے۔ اگر اصلاحات کے پس منظر پر ایک نظر ڈالی جائے اور یہ دیکھا جائے کہ وہ کیا اسباب تھے جن کی بنا پر اورنگ زیب عالمگیر نے اصلاحات جاری کیں تو ایک ایک کر کے وہ تمام اعتراض دور ہو سکتے ہیں جن کو بنیاد بنا کر مؤرخوں نے حقائق کو مسخ کرنے کی جسارت کی ہے۔

رزم آرائی

اسلام نے موروثی اور خاندانی بادشاہت کبھی تسلیم نہیں کی۔

کیونکہ اسلام کے نزدیک خدا کی زمین پر اس کا ہر بندہ ہر فرد اس کا نائب ہے۔ قرآن حکیم میں اس تصور اور نقطۂ نظر کو خلافت کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

خلافت ایک ایسا نظامِ حکومت ہے جس کی بنیاد انتخاب پر ہے۔ بنا بریں یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ دنیا کی تاریخ میں اسلام ہی وہ پہلا اور آخری دین ہے جس نے انتخاب کے ذریعے ایک ایسے نظامِ حکومت کی اساس استوار کی ہے جس کا اہلِ دنیا نے ظہورِ اسلام سے پہلے عملی تو کیا تخیلی طور پر بھی مشاہدہ نہیں کیا۔

خلافت کی معنوی رعایت سے خلافت کا دوسرا نام جمہوریت ہے۔ اگرچہ جمہوریت کا آج مغرب میں بہت چرچا ہے تاہم اسلامی جمہوریت اس سے ارفع و اعلیٰ ہے۔ مغربی جمہوریت کے معنی ہیں عوام کی حکومت، عوام کے لیے۔ اس کے برعکس اسلامی جمہوریت میں انسان کی حکومت کا کوئی تصور نہیں ملتا۔ یہاں حاکمیت مطلقہ اعلیٰ کے لیے اللہ تعالیٰ ہی کی ذاتِ پاک سزاوار ہے۔ لہٰذا سب کے سیاسی حقوق یکساں ہیں نہ کوئی حاکم ہے نہ محکوم۔

مگر افسوس اسلامی جمہوریت (خلافت) کا زمانہ تیس[30] برس سے زیادہ قائم نہ رہ سکا۔ اسے خلافت راشدہ کا دور کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد بنی اُمیّہ، بنی عباس اور ترکانِ عثمانیہ کی جو حکومتیں قائم ہوئیں وہ اگرچہ نہ تو پورے طور پر بادشاہت کا نظام تھیں نہ جمہوریت کا۔ تاہم ان کا نام خلافت ہی رہا۔ مگر مغلوں نے اس کے نظام پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ انہوں نے اسے ایک نظریے کی حد تک بھی قائم نہ رکھا۔

مغلوں نے اپنے اجتہاد سے کام لیتے ہوئے حکومت کی جانشینی کے لیے یہ اصول اختیار کر لیا تھا کہ باپ کے مرنے کے بعد اس کا بڑا بیٹا اس کے تختِ

حکومت کا وارث ہوگا چنانچہ جب یہ طے پا گیا کہ شاہجہان کے بعد اس کا بڑا بیٹا دارا شکوہ اس کا جانشین ہوگا تو اس کی مخالفت کرتے ہوئے مسلمانوں کی اکثریت یعنی اہل سنت والجماعت دارا شکوہ کے ملحدانہ خیالات کو نگاہوں کے سامنے رکھتے ہوئے اورنگزیب عالمگیر کے حامی و ناصر ہو گئے جو ایک سچا مسلمان تھا اور اس فقہ پر عمل کرتا تھا جس کے بانی امام ابو حنیفہ تھے۔

اگرچہ دارا شکوہ کے لشکر میں نہایت آزمودہ اور تجربہ کار سپہ سالار تھے جن میں راجپوتوں اور شیعہ مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ بخلاف اس کے اورنگ زیب عالمگیر کے لشکر میں ناتجربہ کار اہل سنت والجماعت مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ جن میں صرف اورنگزیب عالمگیر اور مراد اس سے مستثنیٰ تھے، یعنی وہ تجربہ کار تھے تاہم دونوں طرف مذہبی عقائد کی بنا پر ہی رزم آرائی ہوئی مگر مظفر و منصور ہونا خدا کی طرف سے اورنگ زیب عالمگیر ہی کا مقدر ہوا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اورنگ زیب کے تختِ حکومت پر قدم رکھتے ہی اسلام کی جڑیں مضبوط ہو گئیں۔

مختصراً یہ کہ حکومت حاصل کرنے کے بعد پچاس برس کی مدت میں عالم گیر کو ہزاروں مشکلیں اور مصیبتیں پیش آئیں۔ جن کا اس نے کمال تدبر اور عزم و ہمت کے ساتھ مقابلہ کیا۔ تاریخ شاہد ناطق ہے کہ اس عظیم المرتبت حکمران کی سیرت و کردار پر کبھی کوئی حرف نہیں آیا۔ حتیٰ کہ ایسے ایسے مؤرخ جو عالمگیر کے مخالف تھے۔ بعض اوقات اس کے اوصافِ حمیدہ کی تعریف کرنے اور اس کی اعلیٰ شخصیت کا اعتراف کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے تھے۔ مثلاً خافی خاں جو ایک شیعہ مؤرخ تھا اور عالمگیر کو پسند نہیں کرتا تھا۔ مگر اس کی کتاب منتخب اللباب دیکھیے جس میں وہ موقع بے موقع بے اختیار عالمگیر

کی تعریف کر جاتا ہے۔

خافی خاں لکھتا ہے راجا جسونت سنگھ نے جب پہلی مرتبہ حملہ کیا تو بڑا سخت حملہ تھا۔ بڑی لوٹ مار مچی، مگر یہ عالم گیر ہی کا ظرف اور حوصلہ تھا کہ اس قیامت کے ہنگامے میں وہ نہایت سنجیدگی اور وقار کی چٹان بنا ہوا اپنی جگہ کھڑا رہا۔ اس کے رویے میں تبدیلی اور سراسیمگی کا ذرا سا بھی شائبہ دکھائی نہیں دیا بلکہ وہ یہ تمام احکامات نافذ کرتے اور تدبیر کرتے ہوئے نہایت خوشدل اور ہشاش بشاش نظر آ رہا تھا۔ کم حوصلہ لوگوں کی طرح نہ تو اس نے بے دماغی کا مظاہرہ کیا نہ غیض و غضب کا اظہار کیا نہ اس کی زبان سے کوئی تلخ اور تند و تیز فقرہ نکلا بلکہ نہایت اطمینان و سکون سے مگر بڑے حکیمانہ انداز میں وہ بھی انتشار کو دور کرنے اور پراگندہ جمعیت کو اکٹھا کرنے میں مصروف رہا اس کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو معلوم بدحواسی میں کیا کچھ کر گزرتا لیکن عالمگیر نے اس واقعہ کو اپنے لیے نیک فال ہی تصور کیا۔ چنانچہ وہ کہا کرتا تھا۔ " اللہ تعالے کا شکر ہے کہ اس ذریعے سے دوست دشمن، موافق اور منافق کی پہچان ہو گئی۔ اور اس کسوٹی پر ہر ایک کا کھوٹا کھرا معلوم ہو گیا۔ اس لیے ہم تو اس واقعے کو عطیہ الٰہی اور وسیلہ کامرانی سمجھتے ہیں اور جو کوتاہ اندیش منافق اس واقعہ کو غنیم کا غلبہ تصور کر کے اس کے لشکر میں چلے گئے ہیں وہ اس کا انجام بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ اس موقعہ پر ایک مست جنگی ہاتھی سر پر چلا آ رہا تھا مگر عالم گیر کے عزم و ہمت اور استقامت کا یہ حال تھا کہ وہ ایک انچ بھی اپنی جگہ سے نہیں ہٹا بلکہ اس نے ہاتھی کے پاؤں میں زنجیریں ڈلوا دیں۔

دارا شکوہ کے ساتھ معرکہ آرائی کے بعد خافی خان لکھتا ہے۔ اورنگ زیب عالمگیر کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی تائید تھی کہ ان چار جنگوں میں ایسے بہادر جنگجو دشمنوں

کے مقابلے میں کامیابی حاصل کی اور نازک سے نازک وقت میں اور بڑے سے بڑے حادثے میں وہ ثابت قدم رہا اور دشمنوں کے غالب آجانے کے باوجود اس کو شکست دیکر بھگا دیا۔ جب اسے داراشکوہ کے فرار ہونے اور فتح پانے کی خبر ملی تو سجدۂ شکر بجالایا۔ پھر اس کے بعد وہ خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کے مزار پر گیا۔ فاتحہ پڑھی اور وہاں کے خادموں کو انعام واکرام دیکر کوچ کیا۔ اور ادھر داراشکوہ کے تعاقب میں راجا جے سنگھ کو ایک لاکھ روپے اور بہادر خاں کو تیس ہزار روپیہ عطا کر کے اور دونوں کو خلعت فاخرہ سے نوازتے ہوئے روانہ کیا۔

آغوشِ محبّت

ہندو اور انگریز مؤرخوں نے اورنگ زیب عالم گیر پر خوب کیچڑ اچھالا ہے۔ اس پر سخت اعتراض کئے ہیں اور کہا ہے کہ وہ سخت متعصب اور غاصب تھا۔ اس نے باپ کو قید کیا اور بھائیوں کو قتل کیا۔ خود مسلمان مؤرخوں میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں مثلاً خافی خاں اور مآثر الامراء کا مؤلف جو عالم گیر کے سخت مخالف تھے۔ اگر عالمگیر کے خطوں کی روشنی میں جو اس نے اپنے باپ کے نام لکھے اس کی سیرت وکردار وعمل کا تجزیہ کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ اورنگ زیب عالمگیر ایک ایسا عادل ومنصف اور باجبروت حکمران تھا جس نے اعلیٰ قدروں اور اسلامی اصولوں پر سلطنت کی بنیاد قائم کی۔ دنیا کی تاریخ میں ایسے حوصلہ مند انسان کی مثال ملنا مشکل ہے۔

ابتداً میں اورنگ زیب عالم گیر، شاہ شجاع اور مراد بخش یہ تینوں ایک طرف تھے اور اپنے پدر گرامی شاہجہان کی حمایت کے سہارے داراشکوہ اکیلا دوسری طرف

اس نے اپنے تینوں بھائیوں عالمگیر، شجاع، اور مراد کو اس زمانے میں بے حد تنگ کرنا شروع کر دیا۔ جب شاہجہان بستر علالت پر دراز ہو گیا اس نے تینوں بھائیوں کے وظیفے بند کر دیئے۔ ان کی جاگیریں ضبط کر لیں۔ اور ان پر فوجیں روانہ کر دیں جس سے ان تینوں کو یہ شبہ پیدا ہو گیا کہ شاہجہان کا انتقال ہو گیا ہے جسے دارا شکوہ نے چھپا رکھا ہے۔

یہ تینوں بھائی دارا شکوہ کو بے دین اور کافر سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر دارا شکوہ بادشاہ بن گیا اور اس کے ہاتھ مضبوط ہو گئے تو اس سے جہاں ایک طرف خود ان کی ذات کو نقصان پہنچے گا وہاں دوسری طرف اسلام کو بھی سخت خطرے سے دوچار ہونا پڑے گا۔ لہذا تینوں بھائیوں نے آپس میں ایک خفیہ معاہدہ کر لیا کہ وہ اس فتنے کو مٹائیں اسلام کی خدمت اور مسلمانوں کی حفاظت کریں۔ اور شاہجہان اگر زندہ ہے تو اسے دارا شکوہ کی قید سے رہائی دلائیں۔

صورت حال یہ تھی کہ شاہجہان کی طویل علالت کے باعث دارا شکوہ باپ کا لاڈلا بیٹا ہونے کے گھمنڈ میں شاہجہان کے نام پر حکومت کرتا تھا۔ اور اسے کاروبارِ حکومت سے بالکل معطل کر دیا تھا۔ علاوہ اس کے یہ کہ دارا شکوہ نے شاہجہان کے خط اور دستخط کی نقل میں ایسی مہارت پیدا کر لی کہ اصل کا گماں ہوتا تھا۔ وہ شاہجہان کے نام سے احکام صادر کرتا تھا جن کی اسے مطلق خبر بھی نہ ہوتی تھی۔ یہ تینوں بھائی صحیح صورتِ حال سے مطلع کرنے کے لیے شاہجہان کے نام جو خط لکھتے تھے دارا شکوہ انہیں شاہجہان تک پہنچنے ہی نہیں دیتا تھا۔ مزید برآں اسی زمانہ اقتدار میں اس نے ہندوؤں کی بے حد طرفداری کی۔ بعض مقامات پر ان کی اس حد تک طرفداری کی کہ

مسلمانوں کو نقصان پہنچانے سے بھی گریز نہ کیا مسجدوں اور بزرگان دین کے مقبروں کو بے دریغ ڈھا دیا۔

ستم بالائے ستم یہ کہ خود شاہجہان نے بھی اپنی بیماری کے باعث کاروبارِ حکومت دارا شکوہ پر چھوڑ دیا تھا۔ اور خود کو اپنی دانست میں معذور اور گوشہ نشین سمجھ لیا درحقیقت وہ دارا شکوہ کی قید میں تھا اور نظر بند تھا۔ مگر بایں ہمہ اس پر مہربان تھا۔ اس نے اسے پہلے ہی سے اپنا جانشین مقرر کر رکھا تھا اب کہ طویل بیماری کے باعث ہاتھ پیر چلنے سے رہ گئے تو اسے اب اپنا نائب سمجھ لیا۔

ایک تو یہ کہ دارا شکوہ لاڈلا بیٹا تھا دوسرے یہ کہ شاہجہان کا نائب تھا اس رعایت اور نسبت سے اس نے اپنے بھائیوں کو مبتلائے مصیبت کئے رکھا اور جو کچھ ان کے خلاف کیا اور امور سلطنت میں من مانی کارروائیاں کیں اُن سب کی شاہجہان کو بالکل خبر نہ ہونے دی۔ تینوں بھائی اپنے معاملات کی صفائی میں جو کچھ باپ کو لکھتے تھے دارا شکوہ ان کے خطوط شاہجہان تک نہیں پہنچنے دیتا تھا۔ جس کا نتیجہ دارا شکوہ کے حق میں بیحد مفید نکلا اور اسے ان زیادتیوں اور اذیتوں کی مطلق اطلاع نہ ہونے پائی۔ جو دارا شکوہ نے اپنے بھائیوں کے لیے روا رکھی تھیں۔

یہ درست ہے کہ دارا شکوہ کے راہ فرار اختیار کرنے کے بعد اورنگ زیب عالمگیر نے بھی شاہجہان کو ایک عرصے تک اسی طرح نظر بند کئے رکھا جس طرح سے اُسے دارا شکوہ نے قید اور نظر بند کر رکھا تھا۔ لیکن اس معاملے میں اورنگ زیب عالم گیر حق بجانب تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ شاہجہان اصل حالات سے بے خبر ہے اور اسے مجرم سمجھتا ہے لہٰذا اگر اس کے اختیارات بحال کر دیئے گئے تو وہ اُسے ضرور

سزا دے گا۔

اورنگ زیب عالمگیر کا اپنے باپ کے بارے میں یہ خیال کس حد تک صحیح تھا اس کا اندازہ اس وقت بخوبی ہو جاتا ہے جب شاہجہان نے داراشکوہ کی شکست اور گرفتاری کے بعد اپنے دونوں بیٹوں شجاع اور مراد کو عالمگیر کے خلاف بھڑکا اور ورغلا کر مقابلے کے لیے تیار کیا اور مراد کو یہاں تک لکھ دیا کہ تم عالم گیر کو قتل کر ڈالو تو سارے ممالک محروسہ کی بادشاہت تمہیں دے دی جائے گی۔ اب ان واقعات کو سامنے رکھتے ہوئے خود فیصلہ کر لیا جائے کہ عالم گیر کا اپنے باپ شاہجہان کو نظر بند رکھنا صحیح تھا کہ غلط ؟ اگر عالمگیر کو شاہجہان سے اپنی جان کا خطرہ نہ ہوتا تو وہ اسے داراشکوہ کی قید سے نجات دلا کر اسے ضرور پھر مطلق العنان حکمران بنا دیتا۔ اورنگ زیب عالمگیر نے اپنے باپ کے نام جو خطوط لکھے ہیں ان میں اس نے باپ کا پورا پورا خیال اور ادب ملحوظِ خاطر رکھا ہے۔ جو دلیل ہے اس بات کی کہ اورنگ زیب عالم گیر نہایت مؤدب اور ایک سعادت مند بیٹا تھا۔ یہی سبب ہے کہ آخر کار شاہجہان کی پدرانہ محبت جوش میں آئی اور عالمگیر کی تمام خطائیں معاف کر دیں۔

مگر بایں ہمہ اورنگ زیب کو شاہجہان کی طرف سے برابر خوف رہا کہ مبادا شاہجہان حاسدوں اور منافقوں کی باتوں میں آ کر پھر اس کی جان کے پیچھے پڑ جائے اور اس کے اشارے پر قلعہ کے اہلکار اس کا کام تمام کر دیں لہٰذا کئی بار اس نے اپنے خطوں میں شاہجہان سے یہ درخواست کی کہ وہ حضور کی قدمبوسی کے لیے حاضر ہونا چاہتا ہے۔ اسے یہ اجازت مرحمت فرمائی جائے کہ وہ قلعے میں اپنے قابل اعتماد جاں نثار اہلکاروں کو متعین کر کے حفاظتی انتظامات کے ساتھ حاضرِ خدمت ہو۔ مگر شاہجہان نے اس کی

اس درخواست کو منظور نہ کیا اگرچہ وہ بادشاہ تھا ایسے لوگوں کو قلعے سے نکال باہر کرنے کی قدرت رکھتا تھا جو اسے قتل کرنے کے لیے شاہجہان کے آلہ کار بن سکتے تھے لیکن عالمگیر نے یہ بات اپنے باپ کی تعلیم اور ادب کے خلاف سمجھی اس لیے اس نے ایسا نہیں کیا۔

لیکن انگریزوں اور ہندوؤں نے مسلمان بادشاہوں کو رسوا کرنے اور نئی نسل کی نگاہوں سے گرانے کی جو مہم چلائی تھی اس میں عالم گیر ہی کا نام سرفہرست تھا۔ لہذا دنیا بھر کے مظالم و مصائب اورنگ زیب عالمگیر کی ذات میں جمع کر دیئے گئے اسے باپ کا نافرمان اور بھائیوں کا قاتل قرار دیا گیا۔ مگر اب شاہجہان، اورنگ زیب عالمگیر اور اس کے بھائیوں کے جو خطوط شائع ہو کر سامنے آئے ہیں اصل حقیقت بے نقاب ہوگئی ہے اور اسلامی ہندوستان کے سلاطین میں وہی ایک ایسا طاقتور اور باجبروت حکمران دکھائی دیتا ہے جس کی پچاس سالہ حکومت اسلامی ہندوستان کا طغرئی امتیاز ہے۔

فتاویٰ عالمگیری

اورنگ زیب عالمگیر کے عہد حکومت سے پہلے فقہ کی کوئی ایسی جامع اور مستند کتاب موجود نہیں تھی جس سے مسائل کے استخراج و استنباط میں پوری پوری مدد مل سکے۔ اورنگ زیب نے اس کمی کو شدت سے محسوس کیا۔ چنانچہ بہت سے علماء و فضلاء کو جمع کر کے ایک قانونی کمیشن بٹھادیا جو اس بات کا جائزہ لے اور منصوبہ تیار کرے کہ اس کمی کو کس طرح پورا کیا جا سکتا ہے۔

اس کمیشن کے سربراہ شیخ نظام برہان پوری تھے، اور اراکین میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے والد شاہ عبدالرحیم۔ ملا محمد جمیل جونپوری۔ قاضی محمد حسین جونپوری۔ علامہ حامد جونپوری۔ شیخ رضی الدین بھاگل پوری۔ علامہ وجیہہ الرب۔ محمد فائق محمد اکرم۔ محمد غوث۔ سید معدن۔ غلام محمد۔ عنایت اللہ وغیرہ علماؤ فضلائے عصر شامل تھے۔ اور اس عظیم کام کے لیے شاہی کتب خانہ وقف کر دیا گیا جس میں بے شمار کتابیں موجود تھیں۔

یہ کتاب جس کی نسبت اورنگ زیب عالمگیر ہی کی طرف منسوب ہے فتاویٰ ہندیہ و فتاویٰ عالم گیری کے نام سے موسوم ہے۔ یہ تقریباً سات آٹھ سال کی شبانہ روز محنت شاقہ سے تیار ہوا۔ ۲ لاکھ روپے کی رقم اس کی تیاری پر صرف ہوئی۔ اس فتاوے میں جہاں نماز۔ حج۔ زکوٰۃ۔ ایمان۔ طہارت۔ نکاح۔ طلاق۔ جہاد اور بیع و شری کے مسائل بیان کئے گئے ہیں وہاں حدود و تعزیر اور قضاء کے آداب اور طریقے بھی واضح کئے گئے ہیں۔

اگر ہم قضاء کے آداب اور طریقوں کا گہری نظر سے مطالعہ کریں تو پتہ چلے گا کہ فوجداری دیوانی اور قانون شہادت میں انگریزوں نے بہت سی باتیں فتاوئ عالمگیری سے ہی اخذ کی ہیں اور اس وقت پاکستان میں اس سلسلے کے جو قوانین رائج ہیں ہم اگرچہ انہیں انگریزوں کا ورثہ اور انگریزی قانون کا حصہ خیال کرتے ہیں تاہم حقیقت میں ایسا نہیں یہ فتاوئ عالمگیری کا ہی فیضان ہے۔

مقدمات کے فیصل کرنے کے سلسلے میں یہ بات بھی صرف ایک پاک و ہند تک ہی محدود نہیں بلکہ اس کی مثال تمام دنیائے اسلام میں بھی موجود ہے۔ جہاں فتاوئ عالمگیری نظیر کا کام دیتا ہے دولت عثمانیہ ترکیہ کے مجلہ میں بھی فتاوئ عالمگیری کا حوالہ موجود ہے اور وہاں عدالت کی کارروائیوں میں اس کا استعمال ہوتا رہا ہے۔

فتاوئ عالمگیری اسلامی فقہ اور قوانین کے لحاظ سے مراکش، انڈونیشیا، ترکی اور ترکستان سے لے کر جنوبی افریقہ کے تمام ملکوں میں ایک مضبوط و مستحکم اور مدلل تصنیف کے برابر اب تک چلا آتا ہے۔ یہ فتاوئ مصر اور دوسرے بہت سے عرب ملکوں میں اب تک کئی بار شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ دنیا کی اُن تمام زبانوں میں بھی مثلاً فرانسیسی۔ انگریزی۔ جرمنی۔ عربی اور فارسی وغیرہ جن میں قوانین اسلامی پر کتابیں لکھی گئی ہیں فتاوئ عالمگیری کے جابجا حوالے مل جاتے ہیں۔ یہ اس کتاب کی مقبولیت کی ایسی دلیل ہے جسے کبھی رد نہیں کیا جاسکتا۔

برطانوی ہند میں عدل و انصاف کا وہ طریقہ یکسر بدل دیا گیا جو اسلامی ہند

کے زمانے میں رائج چلا آتا تھا سلاطین ہند بشمول سلاطین مغلیہ کے زمانے میں عدل وانصاف کا جو طریقہ ہندوستان میں رواج پذیر تھا وہ اسلامی تعلیمات کے عین مطابق تھا مگر جب مغلوں کی بساط سلطنت الٹ گئی اور ہندوستان کے در و بام پر حکومت برطانیہ کا جھنڈا لہرانے لگا تو اس وقت سے انگریزوں نے اسلام کے اُن عدالتی قوانین کو جو عدالت کے ضابطوں اور اس کی کارروائیوں میں استعمال ہوتے تھے، بالکل بدل ڈالا۔ ذاتی اور خاندانی تنازعات کی حد تک اسلام کے جو قوانین انگریزوں نے قائم بھی رکھے تو وہ اس شکل میں کہ اُن پر انگریزوں کے اپنے رجحانات، نظریات اور خیالات کا رنگ غالب رہا۔

اب اس وقت ہمارے ملک پاکستان میں اسلام کا نظام مکمل طور پر لانے کے لیئے اُن قوانین کی چھان پھٹک ہو رہی ہے جو برطانوی ہند کے زمانے سے ملے ہیں۔ اگر اس سلسلے میں فتاویٰ عالمگیری کو بھی سامنے رکھ لیا جائے تو اس سے اسلامی قوانین کے سلسلے میں ہمیں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ اور قوانین کو اسلامی تعلیمات کے مطابق لانے کا مشکل کام بہت آسان ہو جائے گا۔

اصلاحات

مفتی انتظام اللہ شہابی لکھتے ہیں :-

جب عالمگیر کا اکبر سے زیادہ تمام ہندوستان پر کامل تسلّط ہو گیا۔ سلطنت نہایت عروج پر تھی۔ مشرق میں تمام بنگال مع گرد و نواح کے داخل عملداری تھا اور مغرب میں پنجاب اور افغانستان کے علاوہ کشمیر

کے اس پار چھوٹا تبت تک شامل ہند تھا۔

محکمہ احتساب بسر کردگی بلا عیوض وجہ اور شیخا میاں گوپا موی محتسب اجین وغیرہ قائم کیا گیا۔ مسکرات کا استعمال موقوف ہوا اور اس کی آمدنی ناجائز قرار دی گئی۔ شرعی ویں ممالک محروسہ میں شامل کیئے گئے۔ پرچہ نویسی کا باضابطہ اعلیٰ پیمانہ پر انتظام کیا گیا۔ رقص وسرود خلاف شرع رسوم وغیرہ قطعاً بند کر دی گئیں۔ راستہ اور سڑکیں محفوظ کی گئیں کہ رہزن مسافروں کو پریشان نہ کر سکیں۔ ایک لاکھ چالیس ہزار روپیہ محتاجوں کو مقرر کیا۔ ہجڑا بنانے کی رسم حکماً بند کی گئی۔ شیو ناتھ کے مندر کاشی میں جو برہمنوں کی غلط کاری کا مرکز بنائے گئے تھے وہ منہدم کیے گئے۔ اس کے بعد عالمگیر نے اپنے میر منشی رائے چندربھان کی سفارش سے بعد حکم دینے انہدام مندر بنارس کے یہ فرمان جاری کیا کہ ہم اپنا حکم منسوخ کرتے ہیں کہ آیندہ کے لیئے ممانعت ہے کہ کوئی بت خانہ توڑ کر بجائے اس کے مسجد تعمیر نہ ہو۔

بنارس کے مندر کے پجاریوں کے متعلق فرمان اورنگ زیب:

فرمان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

منشور لامع النور اورنگ شاہ بہادر غازی۔

محمد اورنگ زیب شاہ بہادر غازی ابن صاحبقران ثانی۔

لائق العنایۃ والرحمۃ ابو الحسن بالتفات شاہانہ امیدوار بودہ بداند کہ چوں

بمقتضائے مراحم ذاتی و مکارم جبلی ہمت والانہمت و تمامی ست حق طویت ما بر رفاہیت جمہور انام وانتظام احوال طبقات خواص و عوام مصروفیت واز روئے شرع شریف و ملت منیف مقررہ چنین است کہ دیدہا و برہمن بر انداخت منشود و تبکدہ ہا تازہ بنا نیابد و دریں ایام معدلت انتظام بعرض اشرف اقدس ارفع اعلیٰ رسید کہ بعض مردم از راہ عنف و تعدی بہ ہنود سکنہ قصبہ بنارس و برخے امکنہ دیگر کہ نواحی آں واقعیت و جماعتہ برہمناں سدنہ آں محال کہ سدانت بت خانہ ہائے قدیم کہ آنجا بانہا تعلق دارد مزاحم و متعرض می شوند و می خواہند کہ ابناں را از سدانت آں کہ از مدتِ مدید بایشاں متعلق است باز دارند و ایں معنی باعث پریشانی و تفرقہ حال ایں گروہ می گیرد و لہذا حکم والا صادر شود کہ بعد از دورئے ایں منشور لامع النور مقرر کنند کہ من بعد احدے بے حساب تعرض و تشویش باحوال برہمناں و دیگر ہنود متوطنہ آں محال نہ رساند تا آنہا بدستور ایام پیش بجا و مقام خود بودہ بہ جمعیت خاطر بدعا بقائے دولت خدا داد ابد مدت ازل بنیاد قیام نمایند۔ دریں باب تاریخ دارند بتاریخ ۱۵ شہر جمادی الثانیہ ۱۰۶۹ھ۔

مفاد منشور

ابو الحسن کو جو نوازشات و عنایات کا مستحق ہے ہماری شاہانہ التفات کے امیدوار کو جاننا چاہیئے کہ اپنے مراحم ذاتی اور مکارم جبلی کے اقتضا سے ما بدولت و اقبال کے سب سے بڑی مصروفیت یہی ہے کہ خلق آسودہ رہے اور رعایا کے چھوٹے بڑے سب طبقوں کی حالت درست رہے۔ یہ بھی واضح ہو کہ شریعت غرا کے مقدس قانون کے لحاظ سے اگرچہ نئے بتکدوں کی تعمیر کی

اجازت نہیں دی جاسکتی لیکن جو پرانے مندر ہیں وہ ڈھائے بھی نہیں جاسکتے
ان ایام عدالت انتظام میں یہ خبر ہمارے گوش زد ہوتی ہے کہ بعض عمال از راہ جبر و
تعدی قصبہ بنارس اور اس کے نواح کے بعض دوسرے مقامات کے ہندوؤں
اور اس علاقے کے برہمنوں پر جو وہاں کے قدیم بت خانوں کے پروہت ہیں
تشدد کر رہے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ ان برہمنوں کو ان کی پروہتی سے الگ
کر دیں جس کا نتیجہ بجز اس کے اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ یہ بیچارے پریشان ہوں
اور مصیبت میں مبتلا ہو جائیں۔ لہذا تمہیں حکم دیا جاتا ہے کہ اس منشور لامع
النور کے پہونچتے ہی ایسا انتظام کرو کہ کوئی شخص تمہارے علاقے کے برہمنوں
اور دوسرے ہندوؤں کے ساتھ کسی قسم کا تعرض نہ کرے اور ان کی تشویش کا
باعث نہ ہو تاکہ یہ جماعت بدستور سابق اپنی اپنی جگہ اور اپنے اپنے منصبوں
پر قائم رہ کر اطمینان قلب کے ساتھ ہماری دولت خداداد ابد مدت و ازل بنیاد
کے حق میں مشغول دعا رہیں۔ اس باب میں تاکید مزید کی جاتی ہے۔

معافی | تیس لاکھ روپیہ سالانہ کا زائد محصول معاف کیا گیا۔

وسعت سلطنت | کراچی بندرگاہ سے لے کر آسام کی مشرقی حدود، کوہ ہمالیہ سے لیکر بحر ہند کی سطح تک سلطنت کی
وسعت پہنچ گئی تھی۔ عالمگیر کے عہد میں صوبجات ہند کا رقبہ برطانیہ
کے رقبہ کے مساوی تھا۔

محاصل | ۱۶۹۵ء میں کل مالگذاری اسّی کروڑ روپیہ تھی۔

صنعت و حرفت صنعت و حرفت و تجارت کو بھی فروغ تھا صرف ایک پارچہ بافی کو اس قدر ترقی تھی کہ تمام ہندوستان کے لیئے کافی ہونے کے بعد ممالک غیر کو بھی جاتا تھا۔

ہندوستان کی تجارت کا مقابلہ یورپ کے بڑے بڑے ملک بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اسی تجارت و مال کی درآمد و برآمد کا یہ نتیجہ تھا کہ صرف ایک شہر سورت میں چنگی کی آمدنی تیرہ لاکھ روپیہ سالانہ ہوتی تھی۔ اور احمد آباد میں ایک کروڑ تیس لاکھ روپیہ سالانہ چنگی کی آمدنی تھی۔ سورت کے ایک تاجر عبدالغفور نامی جس کا سرمایہ تجارتی ایسٹ انڈیا کمپنی کے برابر تھا۔

معافی محصول عالمگیر نے محصول راہداری کا تمام غلوں سے ما حصل کل اجناس افادہ عام کے واسطے دوامی معاف کر دیا تھا۔

پیمائش اکبر کے عہد میں جو اراضیات پیمائش ہونے سے بچ رہی تھیں اُس کی پیمائش کرائی۔ خلافی خاں لکھتا ہے کہ ۱۰۶۶ھ سے بتیس برس کے زائد میں ممالک دکن کی پیمائش ختم ہوئی اور اس کی جمعبندی اکبری اصول پر مقرر کی گئی۔

ٹیکس خانہ جنگیوں سے خزانہ خالی ہو گیا تھا۔ محاصل برباد ہو گئے تھے۔ سلطنت کے کاروبار چلانے کے لیئے دقت تھی۔ اورنگ زیب نے جہاں تک ہو سکا کوشش کی مگر آخر مجبور ہو کر ہندو مسلمان دونوں پر ٹیکس جاری کر کے مسلمانوں سے

زکوٰۃ اور ہندوؤں سے جزیہ وصول کیا - یہ عام ٹیکس جو آج کل کے ٹیکسوں کے مقابلے میں آٹے میں نمک کی حیثیت رکھتے تھے، صرف مالی مشکلات میں پھنس کر بادشاہ نے عائد کئے تھے -

مذہبی رواداری

عہد عالمگیری کی مذہبی رواداری کا ذکر کپتان ہملٹن اپنے سفر نامے میں شہر ٹھٹھہ کے حالات کے بیان میں لکھتا ہے -

"ریاست کا مسلم مذہب اسلام ہے لیکن تعداد میں اگر دس ہندو ہیں، تو ایک مسلمان ہے - ہندوؤں کے ساتھ مذہبی رواداری پورے طور سے برتی جاتی ہے وہ اپنے بت رکھتے ہیں اور تہواروں کو اسی طرح کرتے ہیں جیسے کہ اگلے زمانے میں کرتے تھے جبکہ خود بادشاہت ہندوؤں کی تھی - وہ اپنے مُردوں کو جلاتے ہیں، لیکن ان کی بیویوں کو اجازت نہیں ہے کہ شوہروں کے ساتھ ستی ہوں -"

بے تعصبی

ہندو اور عیسائی ہندوستان میں امن و آزادی سے زندگی بسر کرتے تھے اور اپنے مذہبی رسوم ادا کرنے کی کوئی روک ٹوک نہ تھی - حتیٰ کہ شراب خوری وغیرہ صرف مسلمانوں کے لیئے ممنوع تھی - اوروں کے لیئے منع نہ تھی - عیسائیوں کے معبد دارالخلافہ میں تھے اور بے روک ٹوک مذہبی فرائض ادا کرتے تھے - ہندو اپنے مندروں میں چاہے جو کریں کوئی پُرسش نہ کی جاتی تھی اُن کے توہمات اور وساوس میں مطلق دخل اندازی نہ کی جاتی تھی -"

اورنگ زیب عالمگیر کی سیرت و کردار

مفتی انتظام اللہ شہابی لکھتے ہیں۔ سلطنتِ مغلیہ کا قدیم سے دستور تھا کہ جب کوئی بادشاہ تخت پر بیٹھتا تو سب شعرائے پایۂ تخت اس کا سکہ کہہ کر لاتے جس کا پسند ہوتا اسے ایک لاکھ روپیہ انعام ملتا۔ عالم گیر کے لیے بھی سکہ کہہ کر لائے۔ عالم گیر نے فرمایا ہم نے بھی سکہ کہا ہے۔ تم سب دیکھو اور اپنی رائے قائم کرو۔

سکہ زد در جہاں چو بدر منیر
شاہ اورنگ زیب عالم گیر

سب کو متفق الالفاظ اقرار کرنا پڑا کہ حقیقت میں اس سے بہتر دوسرا سکہ نہیں ہو سکتا۔

عالم گیر کی ابتدائی زندگی سے ہی طبیعت میں پارسائی اور اتقا تھا۔ خوفِ خدا رکھتے تھے۔ اولاد اور افسرانِ ملک کو خوفِ الٰہی سے ڈراتے رہتے تھے۔ اور ہر قسم کے لہو و لعب سے قدرتی تنفر تھا۔ حالات اور اسباب کے لحاظ سے جس کامیابی کے ساتھ سلطنت کی وہ تاریخ ہند میں بے نظیر ہے۔ شہسواری، تیراندازی، نیزہ بازی، نشانہ بازی، شکار وغیرہ غرض کہ تمام فنونِ حرب میں غایت درجہ کے چست و چالاک اور ہوشیار تھے۔ فقیروں کا دوست ریاکاروں کا دشمن، علماء کا قدردان غرباء و مساکین کے لیے برسرِ عدالت نقدی اپنے پاس رکھتے اور دیتے تھے۔ نرمی اور عفو کا مادہ حد سے زیادہ تھا۔ لوگوں نے اکثر ان کو قتل کرنے کا ارادہ کیا مگر ان

کو معاف کر دیا اور روزینہ مقرر کیا۔ سزائے موت کا شاذ ہی حکم دیا کرتے تھے۔ اپنے آپ کو رعایا اور ملک کا محافظ اور سلطنت کا امین سمجھتے تھے۔ ڈاکٹر برنیئر اپنے سفرنامہ میں عالمگیر کی مستعدی اور بیدار مغزی کا واقعہ لکھتا ہے۔

ایک امیر نے عرض کیا کہ حضور جو کام میں اس قدر مصروف رہتے ہیں اس سے اندیشہ ہے مبادا صحت جسمانی بلکہ قوائے دماغی کے اعتدال اور طاقت کو کچھ نقصان پہنچے۔ بادشاہ نے ناصح کی طرف سے منہ پھیر لیا اور دوسرے امراء کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔ خدا نے مجھے بادشاہت اپنی مخلوق کی خدمت کے لیے دی ہے کہ میں رعایا کی آرام و آسائش کا کافی لحاظ رکھوں۔ اپنی راحت سے زیادہ ان کی راحت کا خیال کروں نہ کہ فضول صلاح کاروں کی رائے پر کاربند ہوں۔ عوام کے ساتھ منصفانہ برتاؤ تھا۔ مگر وہ مخالفوں کے حق میں بہت ہی سخت تھا۔

دارالخلافت دہلی بقول ڈاکٹر ہنٹر اپنی عظمت و شان میں روئے زمین کے دارالخلافتوں سے عہد عالمگیری میں گوئے سبقت لے گیا تھا۔ کہا جاتا ہے اس کی بیس لاکھ کے قریب آبادی ہو گئی تھی۔

عالمگیر آخر عمر میں دکن کے ملکوں کا انتظام کر رہا تھا۔ بڑھاپے کے سبب بیمار ہوا بعمر ۹۱ سال ۱۳ دن بروز جمعہ ۲۸ ذی قعدہ ۱۱۱۸ھ کو وفات ہوئی۔ دولت آباد کے قریب شیخ برہان الدین اور شاہ زری زر بخش کے مزاروں کے درمیان دفن کئے گئے۔ پچاس سال دو ماہ ستائیس روز سلطنت کی۔ تاریخ وفات "دخل الجنۃ" ہے۔

❖

عہدِ عالمگیری کے علما و شعرا

مفسرین | شیخ غلام نقشبندی متوفی ۱۱۲۶ھ۔ ملا شیخ احمد جیون امیٹھوی متوفی ۱۱۳۸ھ۔ مولانا نور الدین متوفی ۱۱۵۵ھ۔ اصغر قنوجی متوفی ۱۱۴۰ھ۔

محدثین | شیخ نور الحق بن شیخ عبد الحق محدث دہلوی متوفی ۱۰۷۳ھ۔ حاجی صبغت اللہ نبیرۂ شیخ اللہ دیہ الرضوی خیرآبادی متوفی ۱۱۵۷ھ

فقہا | افضل المعانی ملا وجیہہ الدین مفتی شیخ عیسیٰ محدث شہابی گوپاموی اتالیق شاہزادہ داراشکوہ و صدر صوبہ اودھ والہ آباد و منصب دار سہ ہزاری مؤلف ربع حصہ فتاویٰ عالمگیر شاہی ۵ جمادی الثانی ۱۰۸۳ھ کو وفات ہوئی۔ ملا شیخ نظام برہان پوری۔ ملا لطیف سلطان پوری۔ ملا عبد الغفور برہان پوری۔

قاضی | قاضی عبد الوہاب متوفی ۱۰۸۷ھ قاضی شیخ الاسلام قاضی صدر الدین ہرگامی۔ قاضی محمد حسین جون پوری۔ قاضی شہاب الدین گوپاموی متوفی ۱۱۳۰ھ

مفتی | قاضی احمد بہاری مفتی عسکر شاہی۔ مفتی عبد اللہ شہابی گوپاموی متوفی ۱۰۷۵ھ مفتی علم اللہ گوپاموی متوفی ۱۱۰۳ھ

حکماء | قاضی محب اللہ بہاری، ملا محمود فاروقی جونپوری متوفی ۱۰۶۳ھ

علماء | ملا عبد الرشید۔ ملا زاہد کابلی محمد اسلم ہروی۔ شیخ عبد العزیز اکبرآبادی ملا عبد اللہ رومی مترجم فتاویٰ عالمگیری، ملا عبد اللہ سیالکوٹی۔

شیخ عبدالباقی جونپوری۔ شیخ قطب برہان پوری اتالیق شاہزادہ محمد اعظم۔ محمد اکرم لاہوری اتالیق شاہزادہ محمد کام بخش قاری حافظ ابراہیم۔

مؤرخین عبدالمجید۔ عاقل خاں رازی۔ محمد ساقی مستعد خاں۔ مرزا محمد کاظم متوفی ۱۱۰۰ھ نعمت خاں عالی متوفی ۱۱۲۱ھ بختاور خاں متوفی ۱۰۹۵ھ

شعراء آشنا۔ ناظم ہروی۔ بیدل۔ ماہر اکبر آبادی۔ افسری۔ اعجاز اکبر آبادی۔ سعید مفتی ابوسعید گوپاموی متوفی ۱۱۴۷ھ۔ ضمیر۔ طاہر۔ خالص اشرف مارسندرانی۔ رازی خوفی۔ ملا طغرائے مشہدی۔ پنڈت چندر بھان برہمن اکبر آبادی متوفی ۱۱۳۰ھ مرزا محمد رفیع قزوینی۔

عالمگیر کے عہد کی تعلیمی ترقیاں

عالم گیر کے عہد کی علمی و تعلیمی ترقیاں برصغیر پاک وہند میں یہاں کے بادشاہوں میں سب سے بڑھ کر تھیں۔ مرکزی شہروں کے علاوہ چھوٹے چھوٹے شہروں اور قصبات اور شرفا بستیوں میں بھی تعلیم پھیلانے کے لیے منجانب حکومت اور امراء مدرسے قائم کئے گئے۔ یہ مدارس علماء کے مدرسوں کے علاوہ تھے۔ طالب علموں کے لیے وظیفے جاری تھے۔ ذاتی مدرسے جن علماء کے تھے ان کو اور سرکاری مدارس کے مدرسین کو معیشت کی طرف سے فارغ البال کیا۔ جاگیریں عطا کیں۔ چنانچہ مفتی عبیداللہ گوپاموی جو شیخ علیلی کے مدرسہ کے صدر مدرس اور ملا وجیہہ الدین گوپاموی مؤلف فتاویٰ عالمگیری کے بھائی تھے کو زمین داری عطا کی۔ غرضیکہ ہر صوبہ اور شہر و قصبہ میں تعلیم کی اشاعت عام ہوگئی۔

عالمگیر کے عہد میں دونوں قسم کے مدرسے قائم تھے۔ شاہی مدرسے جن کے پورے

مصارف حکومت کی طرف سے ادا ہوتے تھے اور جن کا انتظام و انصرام بھی حکومت کے متعلق تھا دوسرے وہ مدرسے جو ارباب خیر اور علمائے دین خود اپنی طرف سے جاری کرتے تھے۔ عالمگیر نے پہلی قسم کے مدرسوں کے لیے ہر صوبہ میں یہ انتظام کر دیا تھا کہ مدرسین اور طالبعلموں کی تنخواہیں اور وظیفے اسی صوبے کے خزانے سے ادا کئے جائیں اور صوبہ دار مدرسین سے تنخواہوں کی وصولی کا سیاہہ حاصل کر کے خزانہ میں داخل کرلیا کرے۔ اور غیر سرکاری مدرسوں کو وقتاً فوقتاً شاہی خزانہ سے امداد دیا کرتا تھا.

اسی طرح غیر سرکاری مدرسوں کی امداد ملاحظہ ہو جو بادشاہ وقتاً فوقتاً کرتا رہتا تھا۔ ایک موقع پر مدرسہ سیف خاں کو ۱۵۰۰ روپے بھیجنے کا ذکر آیا ہے اسی طرح مدرسہ ہدایت بخش و مسجد تعمیر کردہ شیخ محمد اکرام الدین کی تعمیری تجدید و اصلاح کے لیے اس نے ایک لاکھ چوبیس ہزار روپے منظور کئے۔ اسی طرح موضع سوندرہ پرگنہ سانولی اور سلیمہ پرگنہ کڑا کے مدرسوں کے لیے یومیہ مقرر کیا تھا۔

عالمگیر کے دورِ حکومت سے پہلے ابتدائی مکاتب میں ہندو اور مسلمان طلبہ یکجا تعلیم حاصل کرتے تھے اور مکتبوں میں غیر مذہبی تعلیم ہوتی تھی۔ یہاں سے فارغ ہو کر مذہبی مدرسوں میں چلے جاتے تھے اور ہندو طلبہ اپنے مذہبی مدرسوں میں جاتے تھے۔ شاستر کے علاوہ طب اور نجوم وغیرہ کی بھی تعلیم دیجاتی تھی۔ ہندوؤں کے مدارس عالمگیر کے زمانہ میں بھی قائم رہے اور ان کا اہم مرکز بنارس تھا۔

دلی کا سرچشمۂ علم و عرفان جس کے فیوض و برکات سے سارے ہندوستان کی علمی تشنہ کامی دور ہوئی وہ عالمگیر ہی کے عہد میں قائم ہوا. حضرت شاہ عبدالرحیم صاحبؒ دہلوی ابن شیخ وجیہہ الدین شہید نے جو ۱۰۵۴ھ میں پیدا ہوئے اپنے بھائی شیخ ابوالرضا

اور علامہ میر زاہد ہروی سے علوم معقول کی تحصیل کی فتاویٰ عالم گیری کی ترتیب میں
شریک رہے عہد اورنگ زیب میں مدرسہ رحیمیہ قائم کیا۔ خود درس دیتے تھے
میر محمد زاہد ابن اسلم ہروی جنھوں نے مرزا فاضل سے تلمذ کیا۔ مرزا فاضل نے ملّا
یوسف سے اور انھوں نے مرزا شیخ جان الجرہ سے، انھوں نے اپنے والد اسعد سے
وہ علامہ تفتازانی اور علامہ ملّا شریف جرجانی کے شاگرد تھے۔
حدیث حاجی محمد افضل سے جو اس سلسلہ میں شیخ عبدالاحد کے تلامذہ تھے
انہوں نے اپنے والد شیخ محمد سعید سے جن کو اپنے دادا شیخ احمد سرہندی سے تلمذ تھا۔
ملا زاہد ابن اسلم ہروی کا درس آگرہ میں تھا۔ ان کے علاوہ شیخ احمد المعروف ملّا جیون
سید قطب الدین، مبارک بلگرامی اور محمد افضل الہ آبادی کی درسگاہیں بھی تھیں۔

غیر مسلموں سے اورنگ زیب کا طرزِ عمل

چند واقعات

اخبار کشمیر لاہور ۱۹۲۹ء کی اشاعت کے مطابق راجا برج نرائن رئیس پڈرڈنہ صوبہ یوپی نے لکھنؤ میں کشتری جلسے میں تقریر کرتے ہوئے کہا۔ میرے باپ دادا مغلوں کے زمانے میں توپ خانے کے افسر رہ چکے ہیں جن کا دو ہزاری سے پنج ہزاری تک منصب تھا۔ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے میرے بزرگوں رائے امرناتھ اور رائے جی کو حسن خدمات کے صلے میں تینتیس ۳۳ گاؤں عطا کئے اور ایک چھوٹی سی ریاست کا راجا بنا دیا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس ریاست میں برابر ترقی ہوتی رہی حتیٰ کہ ڈھائی لاکھ کشتری دیہ ہمارے ساتھ ہو گئے ہمارے رشتے داروں اور کشتری کماروں کو حسد و بغض کے باعث ہماری دن بدن بڑھتی ہوئی طاقت اور ترقی کانٹے کی طرح چبھنے لگی۔ انہوں نے ہمارے اور شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے درمیان کچھ غلط فہمیاں پیدا کرنے کی کوشش کی مگر اورنگزیب کے آخری عہد تک ہمارے خاندان کے تعلقات مغلیہ حکومت کے ساتھ بدستور قائم رہے۔

(اخبار کشمیر لاہور۔ مارچ ۱۹۲۹ء)

جب اورنگزیب عالمگیر کو یہ اطلاع پہنچی کہ بنارس کے بعض حکام یہاں کے برہمنوں کو ڈراتے دھمکاتے اور ستاتے رہتے ہیں تو شہنشاہ نے بنارس

کے گورنر ابوالحسن کے نام فوراً ایک فرمان بھیجا۔ جس میں سختی سے یہ کہا کہ ہماری شریعت محمدی میں یہ حکم آتا ہے کہ پرانے مندر ہرگز نہ ڈھائے جائیں۔ اور ان کے پجاریوں پر ہرگز سختی نہ کی جائے۔ ہم نے سُنا ہے کہ بنارس کے بعض حکام یہاں کے عوام کو بہت ستاتے اور ان پر جبر و تشدد کرتے ہیں لہٰذا یہ حکم دیا جاتا ہے کہ کوئی شخص کسی برہمن یا ہندو پر نہ جبر و تشدد کرے نہ کوئی بوجھ ڈالے۔ (نگوبل سٹی مصنفہ نرنجمن مین ۔ بی اے ایل ایل بی)

جودھپور کے راجا جسونت کا اورنگ زیب عالمگیر کی فوج سے بار بار مقابلہ ہُوا اور اُس نے ہر بار شکست کھا کر شہنشاہ سے معافی چاہی اور نیک دل شہنشاہ نے اُسے ہر بار معاف کر دیا۔ جب اسی طرح سے چند مرتبہ یہی عمل ہوتا رہا تو اورنگ زیب عالمگیر نے نہ صرف اس کا ملک اُسے بحال کر دیا بلکہ اسے ہفت ہزاری منصب بھی عطا کر دیا اور صوبہ گجرات کا گورنر بنا دیا۔

اس واقعہ کا قابلِ ذکر پہلو یہ ہے کہ شہنشاہ نے یہ اقدام تالیف قلب کے لئے کیا تھا چنانچہ جب جسونت وفات پا گیا تو اُس کے بیٹے اجیت سنگھ کو بھی یہی تمام مناصب تفویض کر دیئے گئے۔

ایک مرتبہ کسی مسلمان نے اورنگ زیب عالمگیر کے حضور میں ایک درخواست پیش کی جس میں استدعا کی گئی تھی کہ شاہی ملازمین کو تنخواہ تقسیم کرنے پر دو ہندو افراد مقرر کئے گئے ہیں وہ مناسب نہیں ان کی جگہ مسلمانوں کا تقرر ہونا چاہیئے اورنگ زیب عالمگیر نے درخواست کے جواب میں کہا۔ سلطنت کے کاموں میں مذہب اور تعصب کو دخل نہیں دینا چاہیئے۔ اور ایسا کیا جائے تو پھر غیر مسلموں کا ٹھکانہ کہاں ہو گا وہ کہاں جائیں گے۔ بات یہ ہے کہ سرکاری ملازمت صرف لیاقت اور قابلیت کی بنیاد پر دی جاتی ہے۔

کلانور کے آس پاس ایک گاؤں واقع ہے جس کا نام دیپال والی ہے وہاں ایک بزرگ شاہ شمس الدین اور بابائی رہا کرتے تھے جو بڑے ولی اللہ تھے۔ ہندو اور مسلمان سبھی ان کے معتقد اور مرید تھے۔ دیپال والی کا ایک ہندو آپ سے بڑی عقیدت رکھتا اور خدمت میں ہمہ تن اور ہمہ وقت موجود رہتا تھا۔ جب شاہ صاحب انتقال کر گئے تو دیپال والی کے ہندوؤں اور مسلمانوں نے متفقہ طور پر اسی ہندو باسی کو شاہ صاحب کے مزار کا مجاور بنا دیا۔

شاہ صاحب کے مزار پر ہندو اور مسلمان سبھی لوگ بکثرت آتے جاتے اور نذر و نیاز لاتے تھے۔ اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں مسلمانوں نے اس کے خلاف دعویٰ کر دیا۔ اور مطالبہ کر دیا کہ اس مزار کا مجاور کوئی مسلمان ہونا چاہیئے۔ مگر اورنگ زیب عالمگیر نے اس مطالبے کو مسترد کرتے ہوئے ہندو ہی کو بدستور قائم رکھا۔ (خلاصۃ التواریخ سبحان رائے بٹالوی)

ملتان میں تولائی کے نام سے ایک مشہور و معروف مندر تھا جس کے لئے اورنگ زیب عالمگیر نے ایک سو روپیہ سالانہ کی جاگیر مقرر کی جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانے تک برابر جاری رہی۔ اس طرح ایک اور گاؤں مصر کر ضلع سیتاپور کے مندر کو بھی کئی گاؤں جاگیریں دیئے۔ متھرا کے قریب بلدیو جی کا مندر ہے اسے بھی کئی گاؤں جاگیریں دیئے۔ دہرہ دون کے گوردوارے کو بھی جاگیر دی۔

اورنگ زیب عالمگیر نے محض قابلیت اور صلاحیت کی بنیاد پر مذہب و ملت کے امتیاز اور تمیز کے بغیر راجا رتن سنگھ کے بڑے بیٹے کو مالوہ کی ریاست (سنباڑہ) عطا کی۔ رائے سنگھ راہور اور گنانتھ کو راجا کا خطاب۔ خلعت اور ایک لاکھ روپیہ نقد اور جواہرات عطا کئے۔ سنبھا جی کو جو سیوا جی کا بیٹا تھا۔ ایک بلند منصب عطا کیا۔ راجا جسونت سنگھ۔ راجا جے سنگھ۔ کنور لعل سنگھ۔

راگھوجی اور لشن سنگھ وغیرہ غیر مسلموں کو مغلیہ افواج کے جنرل. کرنل اور صوبیدار بنا دیا۔

یہاں یہ بات بھی خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ اورنگزیب عالمگیر نے ہندوؤں سے محصول جائزہ موقوف کر دیا. جو پہلے سے رائج چلا آتا تھا۔ اور اسی قسم کے اور بھی کئی ایک ٹیکس تھے جو اورنگزیب عالمگیر نے عام رعایا کو معاف کر دیئے۔

(واقعاتِ ہند مُصنفہ پروفیسر البشوری پرشاد)

پہاڑی ریاستیں جو مغلیہ حکومت کے ماتحت تھیں۔ آئے دن گرو گوبند سنگھ کے جبر و تشدد کا شکار ہوتی رہتی تھیں۔ سب راجاؤں نے مل کر اورنگزیب عالمگیر سے فریاد کی کہ انہیں گرو گوبند سنگھ کے ظلم و ستم سے محفوظ کیا جائے۔ اورنگ زیب عالمگیر نے لاہور کے گورنر نواب زجرت خان اور سرہند کے گورنر شمش الدین خان کو حکم دیا کہ وہ راجاؤں کی حفاظت اور امداد کریں۔

مغلیہ فوج اور گرو گوبند سنگھ کے لشکر کے درمیان آنند پور کے مقام پر معرکہ آرائی ہوئی آخر کار گرو گوبند سنگھ قلعہ بند ہو کر بیٹھ گیا۔ جب مغلیہ فوج نے سات مہینے تک قلعے کا محاصرہ کئے رکھا تو سکھ تنگ آ کر قلعے سے باہر نکلنے لگے۔ گرو نے جب اپنے لشکر کا یہ رنگ دیکھا تو وہ خود بھی وہاں سے نکل بھاگا۔ قاضی پیر محمد۔ غنی خان اور نبی خاں نے فرار ہونے میں گوبند سنگھ کی مدد کی۔

جب مسلسل بھاگتے اور چھپتے رہنے سے گرو گوبند سنگھ تنگ آ گیا تو اُس نے اورنگ زیب عالمگیر کی خدمت میں ایک منظوم فارسی درخواست پیش کی اور کہا اب میں جنگ و جدل سے مُنہ موڑتا ہوں اور خدا کی عبادت میں زندگی بسر کرنے کا آرزو مند ہوں مگر مغلیہ فوجیں میری تلاش میں ہیں اور اب میرے لئے کوئی جائے پناہ نہیں۔

اورنگ زیب عالمگیر نے اس درخواست کے جواب میں یہ لکھ کر بھیج دیا۔
"اگر آپ واقعی عبادت میں مشغول ہونا چاہتے ہیں تو آپ اطمینان رکھیں۔
اب آپ سے کوئی مزاحمت نہیں کرے گا۔ آپ کو اختیار ہے جہاں چاہیں رہیں۔
میں نے تمام حاکموں اور گورنروں کے نام فرمان جاری کر دیا ہے کہ اب وہ آپ
سے ہرگز مزاحم نہ ہوں۔"

(تاریخ پنجاب مصنفہ رائے بہادر کنہیا لال)

سیواجی کا بیٹا سمبھاجی جب قتل ہو گیا تو اُس کے سات برس کے بچے ساہوجی کو اورنگزیب عالمگیر نے اپنی تربیت میں لے لیا۔ اُسے راجا کا خطاب اور ہفت ہزاری کا منصب عطا کیا۔ اس کی دیکھ بھال اور خبر گیری کے لئے اسے ہمیشہ اپنے پاس اور ساتھ ساتھ رکھتا۔ اس کا خیمہ ہمیشہ اپنے خیمے کے پاس لگواتا۔ اورنگزیب عالمگیر نے ساہوجی کے چھوٹے بھائیوں مدن سنگھ اور اودھ سنگھ کو بھی منصب خلعت اور انعام واکرام سے نوازا۔

جب ساہوجی بالغ ہو گیا تو اورنگ زیب عالمگیر نے اسکی شادی بہادر جی مرہٹہ کی بیٹی سے بڑی دھوم دھام سے کی۔ اورنگزیب عالمگیر کی وفات کے بعد جب ساہوجی گدی نشین ہوا تو وہ سب سے پہلے اپنے محسن اورنگ زیب عالمگیر کے مزار کی زیارت کے لئے گیا اور اورنگزیب عالمگیر کی روح کو ثواب پہنچانے کے لئے وہاں مسکینوں فقیروں اور محتاجوں کو کھانا کھلایا اور ان میں زر نقد بھی تقسیم کیا۔

ہندو قوم

خواجہ حسن نظامی دہلوی اپنے ہفتہ وار منادی دہلی میں لکھتے ہیں۔ ہندو قوم کو معلوم ہے کہ حضور نظام (حیدر آباد دکن) کا ملک ہندوستان کی تمام دیسی ریاستوں سے بڑا ملک ہے گویا وہ ہندوستان میں ایک ایسی سلطنت ہے۔ جو رقبے میں ایران کے برابر ہے اور جرمنی کے ملک اور انگریزوں کے ملک (انگلستان) سے زیادہ ہے۔

اس ملک پر چھ سو سال سے مسلمانوں کی حکومت ہے مگر مسلمان حکومتوں نے کبھی ہندو رعایا کو مسلمان کرنے کی کوشش نہیں کی ورنہ چھ سو برس کے عرصے میں وہاں ایک بھی ہندو باقی نہ رہتا سب مسلمان ہو جاتے۔ حالانکہ اس وقت حضور نظام کے ملک میں پچاسی فیصد ہندو ہیں اور پندرہ ۱۵ فی صد مسلمان ہیں۔ اگر ہندوؤں کو جبراً مسلمان کیا جاتا اور جیسا کہ مسلمان بادشاہوں پر الزام لگایا جاتا ہے۔ یہ بات اگر صحیح ہوتی تو آج حضور نظام کی حکومت میں پچاسی فی صد ہندو نہ ہوتے۔

دوسری دلیل حضور نظام کی بے تعصبی کی یہ ہے کہ انہوں نے ملک کا وزیر اعظم مہاراجا سر کشن پرشاد کو بنایا ہے۔ جو کھتری نسل سے ہیں اور جن کے بڑے پنجاب سے دکن گئے تھے۔ (حوالے کے لئے دیکھئے ہفتہ وار منادی دہلی ۱۱ر نومبر ۱۹۲۷ء)

اسی ایک واقعہ پر قیاس کرتے ہوئے بھی اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ کہ متعصب اور متشدد ہندوؤں کے ان دعووں میں کہاں تک صداقت ہے۔ کہ ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں نے ہندوؤں کو تلوار کے زور سے مسلمان کیا اور یہ کہ اورنگ زیب عالمگیر جب تک ہر صبح ایک من یا سوا من

ہندوؤں اور برہمنوں کے جنیئو نہ تڑوالیتا صبح کا کھانا نہیں کھاتا تھا۔ یہ بات صریحاً لغو اور بہتان ہے بفرض محال اگر مان لی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوا، کہ ایک جنیئو کے حساب سے جس کا وزن دس رتی ہوتا ہے ایک من جنیئو کی نسبت سے ۳۰،۲۰ افراد شمار ہوتے ہیں اور سوا من کے حساب سے ۳۸۴۰۰ افراد ہوئے پس اورنگزیب عالمگیر نے جو کامل پچاس برس تک حکومت کی جب دُنیا سے گئے تو اپنے پیچھے پچھتر کروڑ ایسے افراد چھوڑ گئے جنہیں تلوار کے زور سے ہندو سے مسلمان بنایا گیا ظاہر ہے کہ بے بنیاد قصہ گھڑنے والے تاریخی بصارت اور علمی بصیرت سے محروم تھے۔ یہ بات سب جانتے ہیں کہ مسلمان اپنے حاکمانہ دَور سے محکومانہ زندگی تک سنہ ۱۹۴۰ء میں صرف دس کروڑ تھے۔

وصیت کا خلاصہ

اورنگزیب عالمگیر علیہ الرحمہ نے اپنے بیٹے شہزادہ معظم کو اپنی وفات سے پہلے جو وصیت کی وہ یہ تھی۔

۱۔ چار روپے دو آنے جو اس عاجز نے ٹوپیاں سی کر کمائے ہیں وہ محل دار کے پاس جمع ہیں۔ یہ رقم اس عاصی کی منزل رسانی (کفن دفن) پر صرف کی جائے۔

۲۔ مبلغ تین سو پانچ روپے جو قرآن مجید کی نقول کی اُجرت ہے اور میرے پاس موجود ہے، میرے مرنے کے وقت فی سبیل اللہ فقراء میں تقسیم کر دی جائے۔

۳۔ جو چیزیں میرے پاس موجود ہیں وہ میرے لواحقین کو دے دی جائیں۔ منزل رسانی کی رسوم شریعت مصطفویؐ کے مطابق ادا کی جائیں۔

۴۔ اس گنہگار کا سر ننگا رکھا جائے کیونکہ جو گنہگار خدا کے حضور میں سر برہنہ پیش ہوتا ہے وہ معاف کیا جاتا ہے۔

۵۔ میری نعش کو کھدر سے ڈھانپا جائے۔

امام شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے زمانے کے امام یگانہ اور سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ، کے خانوادہ عالیہ کے گل سر سبد تھے۔ اورنگ عالمگیر کی وفات ۱۷۰۷ء کے بعد ہندوستان میں جب مسلمانوں کی آخری حکومت یعنی سلطنت مغلیہ کا زوال شروع ہوا تو شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے سلطنت کو سنبھالا دینے کے لئے کمال حکمت عملی سے کام لے کر اپنا قائدانہ اور مجتہدانہ کردار انجام دیا۔ اگرچہ مسلمانوں کی حکومت سنبھلتے نہ سنبھل سکی تاہم اس سے یہ ضرور ہوا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا ملی وجود اور قومی تشخص قائم رہا۔ جو آگے چل کر تحریک پاکستان کی تمہید بن گیا۔ اس تفصیل کا اجمال حسب ذیل ہے:

اورنگ زیب عالمگیر کی وفات ۱۱۱۸ھ بمطابق ۱۷۰۷ء تک مغلیہ سلطنت کابل سے دریائے ہگلی کے دہانے تک اور سورت سے مدراس تک پھیلی ہوئی تھی جزیرہ نمائے دکن کے سوا تمام ہندوستان پر مسلمانوں کی حکومت کا سکہ رواں تھا۔ پورے پچاس برس تک اورنگ زیب عالمگیر نے حکومت کے فرائض انجام دیئے۔

اورنگ زیب عالمگیر کے بعد جب مسلمانوں کی مذہبی اور سیاسی محاذ آرائی اپنی انتہاء کو پہنچ گئی اور وہ آپس ہی میں لڑنے بھڑنے لگے تو اس نااتفاقی کے باعث مسلمانوں کی حکومت کے خلاف سکھوں، جاٹوں اور مرہٹوں کو سر اٹھانے کا کھلا موقع مل گیا حتیٰ کہ عالمگیر کی وفات کے پچاس برس بعد مرہٹوں نے جنوب میں اتنی طاقت پکڑ لی کہ ان کی فوجیں گجرات

سے ہوتی ہوئی دھلی تک جا پہنچیں۔

اگر نظام دکن اپنی حکمتِ عملی سے مرہٹوں کو دکن میں مشغول نہ رکھتا تو وہ بہت جلد تمام ہندوستان پر قبضہ کر لیتے۔ اب صورت حال یہ تھی کہ ایک طرف مسلمانوں سے مرہٹے اُلجھے ہوئے تھے دوسری طرف مسلمانوں کی باہمی نا اتفاقی سے حکومت میں جو کمزوری پیدا ہو چکی تھی سکھوں نے اس سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے مسلمانوں سے پنجاب چھین لیا۔ تیسری طرف جاٹوں نے آگرے میں اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ مُغلوں کی سیادت سے آزاد ہو کر اودھ اور بنگال میں نوابوں یعنی مسلمان حکمرانوں کی حکومت کے نئے سلسلے برسرِ کار آ گئے چوتھی طرف یہ کہ انگلستان سے تجارت کے بھیس میں جو انگریز آئے اور انہوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے تجارت کا کام شروع کیا وہ رفتہ رفتہ ہندوستان کی حکومت کے معاملات میں دخیل ہو کر کلکتہ، مدراس اور بمبئی کے مالک بن گئے پھر ۱۷۵۷ء میں انہوں نے غداروں کی مدد سے حاکم بنگال نواب سراج الدولہ کو پلاسی کے مقام پر شکست دے کر اپنا تجارتی لباس اُتار پھینکا اور اپنے سر پر حکومت کا تاج سجا لیا اور اب وہ تمام ہندوستان پر بلا شرکت غیرے حکومت کرنے کے خواب دیکھنے لگے۔

اس پر ایک ستم اور ہُوا وہ کہ ایران کا بادشاہ نادر شاہ درانی لوٹ مار کی غرض سے دِلّی پر ۱۷۳۸ء میں حملہ آور ہُوا مُغل بادشاہ محمد شاہ (رنگیلے) کو گرفتار کر کے اُس نے اپنے نام کا خطبہ جاری کر دیا۔ اسی عرصے میں دہلی کے چند لوگوں کی نادر شاہ کی فوج کے ایک چھوٹے سے گروہ کے سپاہیوں سے جھڑپ ہو گئی جس میں چند سپاہی مارے گئے۔ نادر شاہ نے ان کا انتقام لینے کے لئے تین دن تک اھلِ دہلی کا قتل عام کا حکم دے دیا۔

جس سے مُغلوں کی حکومت کی رہی سہی آبرو بھی نادر شاہ کے ہاتھوں جاتی رہی۔ سردارانِ حکومت خود سر ہو کر مرکز سے الگ الگ ہوتے چلے گئے اور مرکزی حکومت کی طاقت

کے ختم ہو جانے کے باعث مغلیہ سلطنت پر ہر طرف سے للچائی ہوئی نگاہیں اُٹھنے لگیں۔

دھلی پر نادر شاہ کی یلغار سے جو بڑی تباہ کن تھی مسلمانوں کے خلاف مرہٹے اور انگریز طاقت پکڑ گئے۔ ۱۷۶۱ء میں جب شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے مرہٹوں کے اقتدار کو تیزی سے آگے بڑھتے دیکھا تو انہوں نے احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان آنے کی دعوت دی جو نادر شاہ درانی کے قتل کے بعد متفقہ طور پر ایران اور افغانستان کا حکمران بنا۔

پانی پت کے میدان میں جہاں لاکھوں مرہٹے اور دوسرے ہندو ایک جھنڈے کے نیچے جمع تھے جو آخری معرکہ سر کرنے کو نکلے تھے۔ احمد شاہ ابدالی کی فوج سے معرکہ ہوا۔ وہ ایک فیصلہ کن میدان کارزار تھا جسمیں دو لاکھ مرہٹے سپاہی قتل ہوئے اور ان کے تمام بڑے بڑے جرنیل مارے گئے جس سے مرہٹوں کی کمر ٹوٹ گئی اور وہ پھر کبھی فوجی طاقت نہ بن سکے۔

اگر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ایسے مخدوش حالات میں احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان آنے کی دعوت نہ دیتے۔ یا مرہٹے اس جنگ میں کامیاب ہو جاتے جو احمد شاہ ابدالی اور مرہٹوں کے درمیان برپا ہوئی۔ تو دُنیا کے نقشے پر پاکستان کبھی نمودار نہ ہوتا۔ اس سلسلے میں جہاں ایک طرف احمد شاہ ابدالی پاک و ہند کے مسلمانوں کا ایک عظیم محسن ہے وہاں دوسری طرف شاہ ولی اللہ محدث بھی مسلمانوں کے عظیم رہنما اور محسن ہیں جن کی کوششوں سے غیر منقسم ہندوستان کے مسلمانوں کا ملی وجود اور جداگانہ تشخص برابر قائم رہا حتیٰ کہ اسی بنیاد پر پاکستان کا قیام عمل میں آگیا جو اسلامی ہندوستان ہی کا نیا نام ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے باب میں اتنا کہنا بس کافی ہے کہ اگرچہ وہ مسلمانوں کی حکومت کے ہندوستان کو غیروں کے تسلط سے نہ بچا سکے اور اس تبدیلی کو روکنے سے قاصر رہے جو شاہ صاحب کی وفات کے بعد برطانوی ہند کی صورت میں سامنے آئی تاہم ان کا یہ

بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کو سکھوں، جاٹوں اور مرہٹوں کے ناپاک عزائم سے بچالیا اور اپنی حکمت عملی اور انقلابی تحریک سے مسلمانوں کو اس لائق بنایا کہ وہ اپنے جداگانہ ملی وجود اور قومی تشخص کو قائم و دائم رکھ سکیں۔

سُنی شیعہ سوال یعنی مذہبی تفرقہ بازی اور منافرت جو مُغلیہ عہدِ حکومت خاص کر اورنگ زیب عالمگیر کے بڑے بیٹے محمدؐ معظم بہادر شاہ کے دور سے پہلے ہندوستان کے مسلمانوں میں کبھی پیدا نہیں ہوئی، شاہ صاحب کے نزدیک ہندوستان کے مسلمانوں کی تباہی و بربادی کی علامت تھی اور انہوں نے مسلمانوں کو اس سے بچنے کی ہمیشہ تلقین فرمائی مگر افسوس تفریق اور نفرت کی یہ خلیج مسلمانوں کے درمیان حائل ہو کر دن بہ دن برابر بڑھتی چلی گئی۔

اس تفصیل کا اجمال یہ ہے کہ تمام شاہانِ مغلیہ اہل سنت والجماعت کا عقیدہ رکھتے تھے۔ اورنگ زیب عالمگیر کا بھی یہی عقیدہ تھا لیکن اُن کے بڑے بیٹے محمدؐ معظم بہادر شاہ نے شیعہ عقیدہ اختیار کر کے اپنے عہدِ حکومت میں جب شیعہ طریق لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ عَلِیٌّ وَلِیُّ اللّٰهِ وَصِیُّ رَسُوْلُ اللّٰهِ خَلِیْفَۃٌ بِلَا فَصْلٍ کو رائج کرنا چاہا اور اس سلسلے میں اپنے بیٹے عظیم الشان کو حکم دیا کہ وہ شیعہ خطیب کو اپنے ساتھ لے کر جائے تاکہ وہ جمعہ کا خُطبہ اُسکی منشاء کے مطابق پڑھے، چنانچہ خطیب نے جونہی نیا خطبہ پڑھنا شروع کیا لوگ اس کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے اور اُسے منبر پر ہی قتل کر ڈالا۔ اس کے بعد مباحثے اور مناظرے ہونے لگے۔ اور مستقل طور سے شیعہ و سُنی کا سوال قائم ہو گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو تباہی و بربادی نے چاروں طرف سے آکر گھیر لیا۔

ہندوستان میں مسلمانوں کو فرقہ واریت کی طرف لانے کا ذمہ دار یقیناً محمدؐ معظم

بہادر شاہ ہے اس کے بعد سے آج تک یہ سلسلہ برابر قائم چلا آ رہا ہے۔ مگر عصر حاضر کے تقاضے یہ ہیں کہ فرقہ واریت کے تمام راستوں کو بند کر کے مسلمانوں کو ایک مرکز پر جمع کیا جائے۔ نسلی۔ لسانی اور صوبائی تعصبات کو ختم کر کے اب انہیں قومی وحدت اور ملی یگانگت کی تعلیم دی جائے تاکہ پاکستان جو اسلامی ہندوستان ہی کا دوسرا نام ہے مضبوط سے مضبوط تر اور مستحکم ہوتا چلا جائے۔

— ایں دعا از من و جملہ جہاں آمین باد —

اورنگزیب عالمگیر کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن مجید

اورنگزیب عالمگیر کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن مجید فوٹو عکس کے ذریعے پہلی بار خواجہ حسن نظامی دہلوی نے جنوری ۱۹۲۸ء میں شائع کیا۔ خواجہ صاحب لکھتے ہیں۔

یہ تمام قرآن مجید غازی اورنگزیب عالمگیر کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ آخر میں غازی اورنگ زیب کے دستخط اور تاریخ بھی ہے، جس کا خط قرآن مجید کے خط سے بالکل مطابقت رکھتا ہے اور یہ قرآن مجید ریاست مانگرول کاٹھیا واڑ کے شاہی کتب خانے میں موجود ہے جس کا عکس لیا گیا ہے۔

(ہفتہ وار منادی دہلی ۱۱ر نومبر ۱۹۲۷ء خواجہ حسن نظامی دہلوی)

toobaa-elibrary.blogspot.com

اختتامیہ

اجمال سلطنت مغلیہ ہند

نام ملوک	سن جلوس	سن علیسوی
ظہیرالدین بابر	۹۳۲ ہجری	بمطابق ۱۵۲۶ء علیسوی
ناصرالدین محمد ہمایوں	۹۳۷ 〃	〃 ۱۵۳۰ 〃
جلال الدین محمد اکبر	۹۶۳ 〃	〃 ۱۵۵۶ 〃
نورالدین جہانگیر	۱۰۱۴ 〃	〃 ۱۶۰۵ 〃
داور بخش بن جہانگیر	۱۰۳۷ 〃	〃 ۱۶۲۷ 〃
شہاب الدین شاہجہان	۱۰۳۷ 〃	〃 ۱۶۲۸ 〃
مراد بخش ابن شاہجہاں	۱۰۶۸ 〃 گجرات	〃 ۱۶۵۸ 〃
شجاع ابن شاہجہاں	۱۰۷۰ 〃 بنگال	〃 ۱۶۶۰ 〃
محی الدین اورنگ زیب عالمگیر	۱۰۶۹ 〃	〃 ۱۶۵۹ 〃
اعظم شاہ	۱۱۱۸ 〃	〃 ۱۷۰۷ 〃
کام بخش	۱۱۱۹ 〃	〃 ۱۷۰۸ 〃
بہادر شاہ اوّل	۱۱۱۹ 〃	〃 ۱۷۰۸ 〃
معزالدین جہاندار	۱۱۲۴ 〃	〃 ۱۷۱۲ 〃
فرخ سیر	۱۱۲۴ 〃	〃 ۱۷۱۳ 〃

شمس الدین	۱۱۳۱ ہجری	بمطابق ۱۷۱۹ عیسوی
رفیع الدولہ	۱۱۳۱ "	" ۱۷۱۹ "
نیکوسیر	۱۱۳۱ "	" ۱۷۱۹ "
ناصر الدین محمد شاہ رنگیلا	۱۱۳۱ "	" ۱۷۱۹ "
ابراہیم	۱۱۳۲ "	" ۱۷۲۰ "
احمد	۱۱۶۱ "	" ۱۷۴۸ "
عزالدین عالمگیر ثانی	۱۱۶۷ "	" ۱۷۵۴ "
شاہجہاں ثالث	۱۱۷۴ "	" ۱۷۶۰ "
جلال الدین شاہ عالم	۱۱۷۳ "	" ۱۷۵۹ "
بیدار بخت	۱۲۰۳ "	" ۱۷۸۸ "
محمد اکبر شاہ ثانی	۱۲۲۱ "	" ۱۸۰۶ "
بہادر شاہ ظفر	۱۲۵۳ - ۱۲۷۵	" ۱۸۳۷ - ۱۸۵۷

ہماری دیگر مطبوعات

کتاب	نوعیت	مصنف
شب چراغ	(شاعری)	واصف علی واصف
کرن کرن سورج	(مضامین)	〃
دلِ دریا سمندر	〃	〃
قطرہ قطرہ قلزم	〃	〃
اورنگ زیب عالمگیر	(اضافہ شدہ ایڈیشن)	سیّد بشیر احمد سعدی سنگروری
ابن رُشد	〃	〃
حیاتِ کشفی	〃	〃
اِکو الف تیرے درکار	(منظوم پنجابی)	منظور احمر
باز آؤ اور زندہ رہو	(مضامین)	محمد حنیف رامے
ترقی پسند اَدب		علی سردار جعفری
کامیاب زندگی	(ترجمہ)	اقبال سلمان
بھوت، بھوت، بھوت	(〃)	اشفاق انور
الحسن رضؓ والحسین رضؓ	(〃)	وجیہہ السیما عرفانی
اقتصادی ترقی کا منظر و پس منظر	(ترجمہ)	محمد حنیف رامے
نیا ہیرو	〃	غلام سرور
سرورِ عالمؐ	(زیرِ طبع)	سیّد بشیر احمد سعدی سنگروری
دس پیغمبر	〃	〃
دس ولی	〃	〃
دس سلطان	〃	〃
دس فاتح	〃	〃

وحید [illegible]